



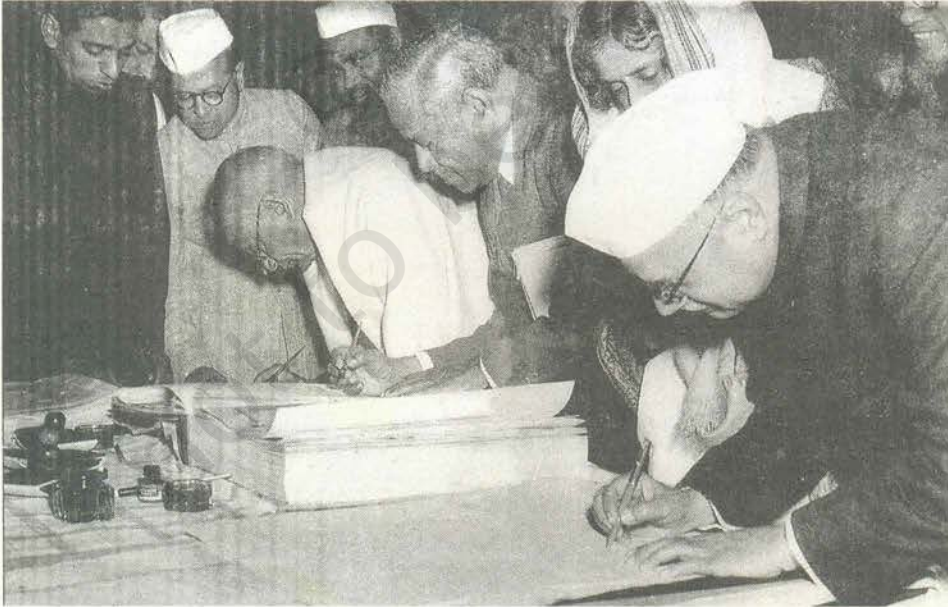
5282CH15

دستور کی تشکیل

ایک نئے عہد کا آغاز

موضوع
پندرہ

ہندوستانی دستور یا آئین جسے 26 جنوری 1950 سے عمل میں لایا گیا دنیا میں سب سے طویل آئین ہونے کی خصوصیت کا حامل ہے۔ جب ہم ملک کے حجم اور تنوع کو ملحوظ رکھیں تب شاید اس کی طوالت اور پیچیدگی ہمارے لیے قابل فہم ہو سکے۔ آزادی کے وقت ہندوستان نہ صرف وسیع اور متنوع بلکہ گہرے طور پر منقسم بھی تھا۔ لہذا ایک دستور کا خاکہ، ملک کو متحد رکھنے کے لیے اور آگے لے جانے کے لیے ہوشیاری سے طے کردہ تفصیلات اور لگن کے ساتھ تحریر کردہ دستاویز کی شکل میں تفصیلی طور پر تیار کرنا ضروری تھا۔ ایک عمل کے لیے اس آئین نے ماضی اور حال کے زخموں کو بھرنے اور مختلف طبقوں، ذاتوں اور فرقوں کے ہندوستانیوں کو ایک مشترک سیاسی تجربے میں مربوط کرنے کی کوشش کی۔ مزید یہ کہ، اس آئین نے طویل عرصے سے مروج نظام مراتب اور پاس و لحاظ کے تہذیب و ثقافت میں جمہوری اداروں کو پروان چڑھانے کی کوشش کی۔



شکل 15.1

تین سال کے بحث و مباحثہ کے بعد دسمبر 1949 میں آئین پر دستخط کیے گئے

ہندوستانی آئین کی تشکیل دسمبر 1946 اور دسمبر 1949 کے درمیان ہوئی۔ اس دوران ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی میں اس کے مسودے کی یکے بعد دیگرے شق پر بحثیں ہوئیں۔ کل ملا کر اسمبلی کے گیارہ اجلاس منعقد ہوئے جو 165 دن کی نشستوں پر مشتمل تھے۔ ان اجلاس کے دوران مختلف کمیٹیوں اور ذیلی کمیٹیوں کے ذریعہ مسودے پر نظر ثانی کا کام ہوتا رہا۔

علم سیاسیات کی نصابی کتاب کے مطالعہ سے آپ واقف ہو چکے ہوں گے کہ ہندوستان کا آئین کیا ہے اور آزادی کے بعد کی دہائیوں میں اس آئین نے کس طرح بندوبست کیا ہے۔ یہ باب آپ کو آئین کی تشکیل کے سلسلے میں جو تاریخ پیچھے چھوڑی ہے اور وہ پر زور بحث و مباحثہ جو اس کی تشکیل کا حصہ رہے ہیں، ان سے متعارف کرائے گا۔ اگر ہم آئین ساز اسمبلی کے اندر اٹھنے والی آوازوں کو سننے کی کوشش کریں تو ہمیں اس طریقہ عمل کا ایک خاکہ مل جائے گا جن کے ذریعہ آئین کی تشکیل ہوئی اور ایک نئے ملک کا تصور تشکیل پایا۔

1. ہنگامہ خیز دور (A Tumultuous Time)



شکل 15.2

غارتگری اور تباہی کی تصاویر آئین ساز اسمبلی کے ممبران کو مسلسل متاثر کرتی رہیں۔

آئین کی تشکیل سے پیشتر کے سال غیر معمولی طور پر ہنگامہ خیز تھے، یہ عظیم امیدوں کے ساتھ ہی نفرت انگیز مایوسی کا دور بھی تھا۔ 15 اگست 1947 کو ہندوستان آزاد تو کر دیا گیا لیکن تقسیم بھی کر دیا گیا تھا۔ لوگوں کے ذہنوں میں 1942 کی ہندوستان چھوڑ و تحریک کی جدوجہد کی یادیں تازہ تھیں جو شاید برطانوی راج کے خلاف سب سے وسیع تحریک تھی۔ اس کے ساتھ ہی غیر ملکی مدد سے مسلح جدوجہد کے ذریعہ آزادی حاصل کرنے کے لیے سبھا ش چندر بوس کے ذریعہ برطانوی حکومت کو دی گئی لکار بھی لوگوں کے ذہن میں تازہ تھی۔ 1946 کے موسم بہار میں بمبئی اور دیگر شہروں میں رائل انڈین نیوی (Royal Indian Navy) کے غیر کمیشن یافتہ ملاحوں (سپاہیوں) کی بغاوت جو زیادہ قریبی بغاوت تھی، سپاہیوں کے تیس عوامی ہمدردی کو ابھار رہی تھی۔ 1940 کی دہائی کے آخری سالوں میں ملک کے مختلف حصوں میں معینہ وقفوں سے منتشر مزدوروں اور کسانوں کے عمومی احتجاجات بھی ہو رہے تھے۔

ان عوامی شورشوں کی جاذب نظر خصوصیت ہندو مسلم اتحاد کا شدید مظاہرہ تھا۔ اس کے برخلاف دو نمایاں ہندوستانی سیاسی پارٹیاں مذہبی مفاہمت اور سماجی ہم آہنگی کے متعلق کسی تصفیہ پر پہنچنے میں بار بار ناکام ہو رہی تھیں۔ اگست 1946 میں کلکتہ میں شروع ہونے والی عظیم ہلاکتوں کے ساتھ شمالی اور مشرقی ہندوستان میں تقریباً سال بھر تک فسادات کا سلسلہ جاری رہا۔ (دیکھیے باب

13 اور 14)۔ تشدد کی انتہا قتل عام کی شکل میں ہوئی جب ہندوستان کی تقسیم کا اعلان کیا گیا جو آبادی کی منتقلی کا اعلان بھی تھا۔

15 اگست 1947 کو یوم آزادی پر جو خوشی اور امید کا اظہار کیا گیا وہ ان لوگوں کے لیے ناقابل فراموش تھا جو اس دور میں زندہ تھے، لیکن ہندوستان میں ان گنت مسلمانوں اور پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں کو ایذا رساں انتخاب کا سامنا کرنا تھا۔ ایک طرف یکا یک موت یا مواقع کا

شکل 15.3



14 اگست 1947 کی نصف شب میں جواہر لعل نہرو دستور ساز اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے اس دن جواہر لعل نہرو نے اپنی تقریر مندرجہ ذیل سطروں کے ساتھ شروع کی

”کافی عرصہ پہلے ہم نے تقدیر کے ساتھ ملاقات کرنے کا عہد کیا تھا اور اب وہ وقت آ گیا ہے جب ہم اپنے عہد کو پورا کریں گے، نہ صرف مکمل طور پر یا پوری مقدار میں بلکہ بڑی حد تک پورا کریں گے“

نصف شب کی ساعت کی ضرب پر جب دنیا سو رہی ہے ہندوستان زندگی اور آزادی کے لیے بیدار ہو رہا ہے۔

استصال اور دوسری طرف اپنی قدیم جڑوں سے اکھڑ جانے کا جبراً سلوک لاکھوں پناہ گزین حرکت پذیر تھے۔ مسلمان مشرقی اور مغربی پاکستان کی طرف تو ہندو اور سکھ مغربی بنگال اور پنجاب کے نصف مشرق کی طرف حرکت کر رہے تھے۔ بہت سے افراد اپنی منزل مقصود تک پہنچنے سے قبل ہی ہلاک ہو چکے تھے۔

نئے ملک کو ایک دوسرے اور بمشکل کم سنجیدہ مسئلہ کا سامنا تھا جو شاہی ریاستوں کا تھا۔ برطانوی حکمرانی کے دوران برصغیر کا تقریباً ایک تہائی علاقہ نوابوں اور مہاراجاؤں کے ماتحت تھا جو برطانوی تاج کی اطاعت قبول کر چکے تھے لیکن بہ لحاظ دیگر زیادہ تر کو انگریزوں نے اپنی قلمرو کو حسب منشا حکمرانی کرنے یا من مانی حکومت چلانے کے لیے آزاد چھوڑ دیا کرتے تھے۔ جب انگریزوں نے ہندوستان چھوڑا تو ان نوابوں اور راجاؤں کی آئینی حیثیت مبہم بنی رہی۔ ایک ہم عصر شاہد نے رائے زنی کی تھی کہ کچھ مہاراجاؤں نے تو اب بہت سے حصوں میں تقسیم ہند کے بعد آزاد اقتدار کے پر اگندہ خوابوں میں عیش کرنا شروع کر دیا تھا۔

یہ وہ پس منظر تھا جس میں دستور ساز اسمبلی اجلاس کر رہی تھی۔ باہر جو کچھ واقع ہو رہا تھا اس سے آئین ساز اسمبلی کے اندر ہونے والے بحث و مباحثے کس طرح الگ رہ سکتے تھے؟

1.1 دستور ساز اسمبلی کی تشکیل

(The making of the Constituent Assembly)

1946 کے صوبائی الیکشن کی بنیاد پر دستور ساز اسمبلی کے ممبران کا انتخاب کیا گیا۔ برطانوی ہندوستان کے صوبوں کے ذریعہ بھیجے گئے ممبران کے علاوہ اسمبلی میں شاہی ریاستوں کے نمائندے بھی شامل تھے۔ انھیں اس لیے بھیجا گیا تھا کیونکہ یہ ریاستیں بھی یکے بعد دیگرے ہندوستانی اتحاد میں شامل ہو چکی تھیں۔ مسلم لیگ نے ابتدائی اجلاسوں (یعنی جو 15 اگست 1947 سے قبل منعقد ہوئے تھے) کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا تھا لہذا یہ اجلاس ایک واحد پارٹی کی نمائندگی بن گئے اس لیے کہ کل ممبران میں 82 فی صد ممبران کانگریس پارٹی کے تھے۔

کانگریس بذات خود ایک وسیع محاذ رکھتی تھی اس کے ممبران بھی آرا کا ایک وسیع سلسلہ رکھتے تھے۔ ان میں سے کچھ ملحد اور سیکولر تھے اور دیگر (ایک اینگلو انڈین ممبر فرینک اینتھونی کے الفاظ میں) تکنیکی طور سے کانگریس کے لیکن روحانی سطح پر آریس ایس اور ہندو مہاسبھا کے ممبر تھے۔ بعض اپنے معاشی فلسفہ میں سوشلسٹ (اشتراکی) تھے تو دیگر چند زمین داروں کے حقوق کے محافظ تھے۔ اندرونی تنوع کے علاوہ کانگریس نے مختلف ذاتوں اور مذہبی گروہوں کی نمائندگی کو یقینی بنانے کے لیے آزاد ممبران اور خواتین کو بھی نامزد کیا تھا۔ اس نے خاص طور پر آئین ساز اسمبلی میں ماہرین قانون کو لانے کی کوشش کی۔ دستور (آئین) ساز اسمبلی کے اندر واقع ہونے والے شدید بحث و مباحثہ سے آرا کے تنوع کی عکاسی ہوتی ہے۔

ایسے وقت میں جب کہ دستور ساز اسمبلی میں غور و فکر جاری تھا تو فریقین کے دلائل اخبارات میں شائع ہوا کرتے اور تجاویز پر عوامی مباحثے بھی ہوتے تھے۔ پریس (اخبارات) میں ہونے والی تنقید اور جوابی تنقید سے واضح مسائل پر باری باری بننے والی عمومی اتفاق رائے کی نوعیت بالآخر ایک قالب تک پہنچ جاتی تھی۔ بہ لحاظ ترتیب اجتماعی شرکت داری کا شعور پیدا کرنے کے لیے عوام سے ان کی رائے بھی پیش کرنے کے لیے کہا جاتا تھا۔ اس ضمن میں سینکڑوں جوابی رد عمل سامنے آئے۔ ان میں سے چند نمونوں سے یہ اشارے ملے کہ قانون سازوں کو کتنے باہم مخالف مفادات زیر غور لانے تھے۔ اسی طرح آل انڈیا ورن آشرم سوراجیہ سنگھ (حکومت میں قائم) نے درخواست کی کہ ”آئین (دستور) قدیم ہندو کتابوں میں مذکورہ اصولوں پر مبنی ہونا چاہیے۔“ گائے ذبح کرنے کی ممانعت اور مذبح خانوں کو بند کرنے کی خصوصی طور پر سفارش کی گئی۔ چلی ذاتوں کے گروہ نے مطالبہ کیا کہ ”اعلیٰ ذات کے لوگوں کے ذریعہ غلط رویے“ کا خاتمہ ہو اور ان کی آبادی کی بنیاد پر قانون



شکل 15.4

دستور ساز اسمبلی کا اجلاس

سر دارولہ بھائی پٹیل دائیں سے دوسری سیٹ پر بیٹھے نظر آرہے ہیں۔

ساز اداروں، سرکاری محکموں اور مقامی اداروں وغیرہ میں علاحدہ نشستیں محفوظ ہوں ”لسانی اقلیتوں نے مادری زبان میں اظہار رائے کی آزادی اور لسانی بنیاد پر صوبوں کی از سر نو تقسیم“ کے لیے کہا۔ مذہبی اقلیتوں نے مخصوص حفظ ماقدم کے لیے درخواست کی اور وزیرانگرم کے ضلع ٹیچر کی گلد (انجمن) اور سینٹرل جیوش بورڈ آف بائیس نے درخواست کی کہ تمام عوامی اداروں بشمول قانون ساز اداروں وغیرہ میں ان کو مناسب نمائندگی ملنی چاہیے۔

1.2 ذی اثر آوازیں (The dominant voices)

دستور ساز اسمبلی میں کل ملا کر 300 ممبران تھے۔ ان میں سے چھ ممبران نے خاص طور پر اہم کردار ادا کیا، جن میں سے تین جواہر لعل نہرو، دلہ بھائی پٹیل اور راجندر پرساد کانگریس کے نمائندے تھے۔ یہ نہرو ہی تھے جنہوں نے ”فیصلہ کن اہداف“ (مقاصد) قرارداد پیش کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی قرارداد میں تجویز کیا تھا کہ ہندوستان کا قومی پرچم ”زعفرانی، سفید اور گہرے ہرے رنگ کی مساوی تناسب کی وسیع متوازی پٹیوں کا ترنگا“ ہوگا جس کے درمیان میں نیلے رنگ کا دائرہ ہوگا۔ دوسری طرف پس پردہ زیادہ تر کام پٹیل کر رہے تھے۔ انہوں نے اہم کردار ادا کرتے ہوئے نہت سی رپورٹوں کے مسودے تحریر کیے اور باہم مخالف نقطہ نظر میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے کام کیے۔ راجندر پرساد کانگریس کے صدر کے طور پر تھا جہاں انہیں بحث و مباحثہ کے لیے تعمیری خطوط پر رہنمائی کرنی تھی اور اس دوران انہیں اس بات کو بھی یقینی بنانا تھا کہ تمام ممبران کو اپنی بات کہنے کے لیے موقع ملے۔

کانگریس کے اس مثلث کے علاوہ اسمبلی کے ایک انتہائی اہم ممبر، نامور وکیل اور ماہر معاشیات

بھیم راؤ امبیڈکر بھی تھے۔ برطانوی عہد حکمرانی کے دوران امبیڈکر کانگریس کے سیاسی مخالف رہے تھے، لیکن آزادی کے وقت گاندھی جی کے مشورے پر ان سے یونین کاہنہ میں بطور وزیر قانون شامل کرنے کے لیے درخواست کی گئی۔ اس حیثیت سے انھوں نے دستور کی مسودہ ساز کمیٹی (Drafting Committee of the Constitution) کے چیئرمین (صدر نشین) کے طور پر کام کیا۔ ان کے ساتھ دو اور دیگر وکیل بھی کام کر رہے تھے جن میں ایک گجرات سے کے۔ ایم۔ منشی اور دوسرے الادی کرشنا سوامی ایدر اس سے تھے۔ دونوں نے ہی دستور کے مسودے میں فیصلہ کن اضافہ کیے۔

ان چھ ممبران کو دو انتظامی افسران بھی ناگزیر مدد دے رہے تھے جن میں ایک بی۔ این۔ راؤ تھے جو حکومت ہند کے آئینی مشیر تھے۔ انھوں نے دیگر ممالک میں رواج پذیر سیاسی نظاموں کے نزدیکی مطالعہ کی بنیاد پر توضیحی مقالوں کا ایک سلسلہ تیار کیا تھا۔ دوسرے افسر آئین کے خاص خاکہ ساز (قانون کا مسودہ مرتب کرنے والے) ایس۔ این۔ مکھرجی تھے جن کے متعلق امبیڈکر نے کہا تھا کہ ”ان کی نہایت پیچیدہ تجاویز کو انتہائی آسان اور نہایت واضح قانونی شکل میں رکھنے کی صلاحیت کا شاذ و نادر ہی کوئی برابری کر سکتا ہے۔“

امبیڈکر کے پاس اسمبلی کے ذریعہ آئین کے مسودہ کے انصرام کی ذمہ داری بھی تھی۔ اس کام میں کل ملا کر تین سال کا عرصہ لگا جس میں ہوئے بحث و مباحثہ کے طبع شدہ ریکارڈ گیارہ ضخیم جلدوں میں شائع ہوئے۔ حالانکہ یہ ایک لمبا طریقہ عمل تھا تاہم انتہائی دلچسپ بھی تھا۔ دستور ساز اسمبلی کے ممبران نے گاہے بہ گاہے بڑی حد تک اپنے منتشر نقطہ نظر واضح انداز میں پیش کیے۔ ان کی پیش کش کے اظہار میں ہم ہندوستان کے بہت سے باہم مخالف تصورات — ہندوستانیوں کو کیسی زبان بولنی چاہیے، ملک کو کیسے سیاسی و معاشی نظاموں پر عمل کرنا چاہیے، اس کے شہریوں کو کس نوعیت کی اخلاقی اقدار کی توثیق کرنی چاہیے یا بری الذمہ ہونا چاہیے — کا ادراک کر سکتے ہیں۔

● بحث کیجیے.....

باب 13 اور 14 کو ایک بار پھر پڑھیے۔ بحث کیجیے کہ اس زمانے کے سیاسی حالات نے دستور ساز اسمبلی کے اندر بحث و مباحثہ کی نوعیت کو کس طرح قالب دیا ہوگا۔



2. آئین کی بصارت

شکل 15.5

بہیم راؤ امبیڈکر ہندو کوڈ بیل (Hindu Code Bill) پر بحث و مباحثہ کرتے ہوئے

(THE VISION OF THE CONSTITUTION)

13 دسمبر 1946 کو جواہر لعل نہرو نے دستور اسمبلی میں ”اہداف قرارداد“ (Objectives Resolution) پیش کی۔ یہ عظیم اہمیت کی حامل قرارداد تھی جس میں آزاد ہندوستان کے آئین کے نصب العین کی توضیح کرتے ہوئے ایک خاکہ اور ایک بنیادی ڈھانچہ مہیا کرایا گیا تھا جس کے اندر رہ کر دستور سازی کا کام آگے بڑھانا تھا۔ اس میں ہندوستان کو ”آزاد خود مختار جمہوریہ“ اعلان کیا گیا تھا، اپنے شہریوں کو انصاف، مساوات اور آزادی کی ضمانت دی گئی تھی اور یہ یقین دہا نی کرائی گئی تھی کہ ”اقلیتوں، پسماندہ اور قبائلی علاقوں اور پست و خستہ حال اور دیگر پسماندہ طبقات کے لیے اطمینان بخش تحفظ مہیا کرایا جائے گا۔“ ان مقاصد کی نشاندہی کرنے کے بعد نہرو نے ہندوستانی تجربے کو وسیع تاریخی تناظر میں پیش کیا جیسا کہ انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ایسے حقوق کی دستاویزات تیار کرنے کے لیے ان کا ذہن ماضی میں اس طرح کے کارناموں کی طرف جا رہا تھا۔

”ہم صرف نقل کرنے نہیں جا رہے ہیں“ (“We are not going just to copy”)

13 دسمبر 1946 کو جواہر لعل نہرو نے اپنی تقریر میں کہا تھا:

میرا ذہن ماضی میں منعقد مختلف دستور ساز اسمبلیوں کی طرف جا رہا ہے جو بہت پہلے عظیم امریکی ملک کے دستور کی تشکیل کا کام انجام دے چکی ہیں جب امریکہ کے اکابرین قوم نے اس کو منظور کر کے رائج کر دیا تھا، جو اتنے سالوں، ڈیڑھ صدی سے بھی زیادہ عرصہ سے کوئی پرپورا اثر ہے جس کے نتیجے میں وہ ایک عظیم ملک بنا چوا سی آئین کی بنیاد پر تعمیر ہوا تھا۔ میرا ذہن ماضی میں اس انقلاب کی طرف جاتا ہے جو 150 سال پہلے واقع ہوا تھا اور اس دستور ساز اسمبلی کی طرف خیال جاتا ہے جو آزادی کے لیے اتنی ساری لڑائیاں لڑنے والے پیرس کے دلفریب اور خوبصورت شہر میں منعقد ہوئی تھی۔ اس دستور ساز اسمبلی نے کتنی مشکلات کا سامنا کیا اور کس طرح بادشاہ اور دیگر مختار کار حکومت اس کے راستے میں آئے اور یہ سب باتیں اب تک مسلسل میرے ذہن میں آ رہی ہیں۔ ایوان یہ بات یاد رکھے گا کہ جب ایسی مشکلات آئیں اور حتیٰ کہ دستور ساز اسمبلی کو اجلاس منعقد کرنے کے لیے ایک کمرہ دینے سے انکار کر دیا گیا تو پھر انھوں نے خود ایک کھلے ٹینس میدان میں نشست کر کے اجلاس کیا تھا اور حلف لیا تھا جسے ٹینس کورٹ کا حلف کہا جاتا ہے۔ انھوں نے بادشاہ اور دیگر لوگوں کی رکاوٹوں کے باوجود اپنی مینٹنکس جاری رکھیں اور تب تک وہ وہاں سے منتشر نہیں ہوئے جب تک انھوں نے اپنا کام مکمل نہیں کر لیا۔ ہاں مجھے یقین ہے کہ ہم بھی اسی باوقار حوصلے سے یہاں اجلاس (مینٹنک) کر رہے ہیں اور خواہ ہمارا اجلاس اس ہال میں ہو یا کسی دیگر ہال میں یا میدان میں ہو یا بازار میں ہو ہماری مینٹنکس تب تک جاری رہیں گی جب تک ہم اپنا کام مکمل نہیں کر لیں گے۔

اس موقع پر میرا دھیان حال ہی میں واقع ہونے والے ایک انقلاب کی طرف جاتا ہے جس سے ایک نئی قسم کی ریاست کا عروج ہوا۔ یہ انقلاب روس میں آیا تھا اور جس سے یونین آف سوویت سوشلسٹ ریپبلک (Union of Soviet Socialist Republic) وجود میں آیا۔ ایک دیگر طاقتور ملک جو دنیا میں ایک غیر معمولی کردار ادا کر رہا ہے، نہ صرف ایک طاقتور ملک ہے بلکہ ہندوستان میں ہمارے لیے، ایک پڑوسی ملک بھی ہے۔ لہذا ہمارا دھیان ماضی کی عظیم مثالوں کی طرف جاتا ہے اور ان کی کامیابی سے ہمیں سیکھنے اور ناکامیوں سے گریز کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ممکن ہے ہم ان ناکامیوں سے گریز کرنے کے اہل نہ ہوں کیونکہ کسی بھی انسانی کوشش میں فطری طور پر جزوی ناکامی کی گنجائش موجود ہے، تاہم تمام رکاوٹوں اور پریشانیوں کے باوجود، مجھے یقین ہے کہ ہم آگے بڑھیں گے اور اس خواب کو حاصل کر کے حقیقت آفریں بنائیں گے جو ہم ایک طویل عرصہ سے دیکھ رہے تھے۔ ہمارا کہنا ہے کہ ایک آزاد خود مختار جمہوریہ بننے کے لیے ہمارا یہ پختہ اور باوقار فیصلہ ہے۔ ہندوستان کا ایک خود مختار ملک ہونا طے شدہ ہے، اس کا آزاد ہونا اور جمہوریہ بننا یقینی ہے..... اب کچھ دوستوں نے سوال اٹھایا ہے کہ آپ نے یہاں ”جمہوریت“ لفظ کیوں نہیں رکھا؟ ٹھیک ہے، میں نے ان سے کہا کہ بے شک یہ قابل فہم کہ کوئی جمہوریہ جمہوریت نہ ہو لیکن ہمارا پورا ماضی اس بات کا گواہ ہے کہ ہم جمہوری اداروں کے ہی طرفدار ہیں۔ واضح طور پر ہمارا مقصد جمہوریت ہے، جمہوریت نے دنیا کی ترقی میں عظیم کردار ادا کیا ہے ان میں سے بہت سی یورپ میں اور دیگر جگہوں میں ہیں۔ تاہم یہ مشتبہ ہو سکتا ہے کہ اگر انھیں طویل عرصہ تک مکمل طور پر جمہوریت بنے رہنا ہے تو نہ جانے کب ان کو اپنی شکل کسی قدر تبدیل کرنی پڑے۔ مجھے یقینی ہے کہ یقین جمہوری طریقہ عمل یا نام نہاد جمہوری ملک کے ایک ادارے کی ہم صرف نقل کرنے نہیں جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم ان پر اضافہ کر سکیں۔ بہر حال، ہم یہاں کیسا ہی نظام

حکومت قائم کریں وہ ہمارے لوگوں کے مزاج سے ہم آہنگ اور ان کے لیے قابل قبول ضروریوں کا ہے۔ ہم جمہوریت کی حمایت کر رہے ہیں۔ یہ بات اس ایوان کو طے کرنی ہوگی کہ جمہوریت یعنی پوری طرح مکمل جمہوریت کی شکل کیا ہوگی۔ مجھے امید ہے ایوان نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ اس قرارداد میں اگرچہ ہم نے لفظ ”جمہوریت“ کا استعمال نہیں کیا ہے کیونکہ ہم سوچتے ہیں کہ یہ فطری ہے کہ لفظ ”جمہوریت“ میں وہ لفظ اندر سما ہوا ہے اور ہم غیر ضروری اور بے کار الفاظ کا استعمال کرنا نہیں چاہتے۔ ہم لفظ استعمال کرنے کے بجائے اس سے کہیں زیادہ کر چکے ہیں۔ ہم نے اس قرارداد میں جمہوریت کا متن پیش کیا ہے اور نہ صرف یہ کہ جمہوریت کا متن بلکہ اگر میں کہوں تو اس قرارداد میں معاشی جمہوریت کا متن بھی پیش کیا ہے۔ دیگر لوگوں کو شاید اس بات پر اعتراض ہو کہ تم نے اس قرارداد میں ہندوستان کو ایک سوشلسٹ (اشتراکی) ملک بنانے کا ذکر نہیں کیا۔ ٹھیک، میں اشتراکیت (Socialism) کا حمایتی ہوں اور مجھے امید ہے ایک دن ہندوستان بھی اشتراکیت کا حمایتی ہوگا اور وہ ہندوستان ایک اشتراکی ریاست کے آئین کی طرح چلے گا اور مجھے یقین ہے کہ ایک دن پوری دنیا اسی راستے پر چلے گی۔

دستور ساز اسمبلی مباحثہ (سی ای ڈی) جلد اول



نہرو کی تقریر (ماخذ 1) کی خوبوں کی محتاط انداز میں تفتیش کرنی ہوگی۔ یہاں صحیح طور پر کیا بیان کیا گیا ہے؟ نہرو کی بظاہر ماضی کی حسرت ناک یادوں کی طرف واپسی کی ترجمانی سے کیا پتہ چلتا ہے؟ آئین کی بصارت میں شامل تصورات کی اصل سے متعلق وہ کیا کہتے ہیں؟ ماضی کی طرف جاتے ہوئے اور امریکی و فرانسیسی انقلابات کا حوالہ دیتے ہوئے نہرو ہندوستان میں آئین کی تشکیل کی تاریخ کو حریت اور آزادی کے لیے جدوجہد کی طویل تاریخ سے منسوب کر رہے ہیں۔ ہندوستانی تدبیر کی عظیم سرشت کو ماضی میں انقلابی لمحات سے مربوط کرنے کا اصرار کر رہے ہیں۔ لیکن نہرو یہ مشورہ نہیں دیتے کہ وہ واقعات حال کے لیے کوئی منصوبہ کا خاکہ (Blueprint) مہیا کر رہے ہیں یا کسی ان انقلابات کے تصورات کو بے شعوری ارادے کے مستعار لیا جاسکتا ہے اور ہندوستان میں نافذ کیا جاسکتا ہے۔ وہ جمہوریت کی کسی مخصوص شکل کی توضیح اور تجویز نہیں کر رہے تھے کہ یہ بحث و مباحثہ اور غور و فکر کے ذریعہ طے ہوگی۔ انھوں نے تاکید کی کہ ہندوستان میں متعارف آئین کے نصب العین اور پیش بندیاں کیس اور پہاخذ کی ہوئی نہیں ہو سکتی۔ انھوں نے کہا تھا ہم صرف نقل کرنے نہیں جا رہے ہیں۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ہندوستان میں حکومت کا جو بھی

ماخذ 1 میں اہداف (مقاصد) قرارداد میں اصطلاح جمہوریت کا استعمال نہ کرنے کے لیے جواہر لعل نہرو نے کیا توضیح پیش کی؟

نظام قائم ہووہ ہمارے لوگوں کے مزاج سے ہم آہنگ اور ان کے لیے قابل قبول ہونا چاہیے۔ مغرب کے لوگوں سے ان کے کارناموں اور ناکامیوں سے سیکھنا ضروری ہے لیکن مغربی ممالک کو بھی کہیں اور ہونے والے تجربات سے سیکھنا پڑا تھا اور انھیں جمہوریت کا اپنے خود کا تصور بھی تبدیل کرنا پڑا تھا۔ ہندوستانی آئین کا مقصد جمہوریت کے حریت پسند تصورات کی معاشی انصاف کے اشتراکی تصور کے ساتھ آمیزش کرنی ہوگی اور ہندوستانی تناظر کے اندر ان تمام تصورات کو نئی وضع سے بنانا ہوگا اور نئے سرے سے مطابقت پیدا کرنی ہوگی۔ کیا نہرو کی دلیل حجت ہندوستان کے لیے موزوں ہے، اس کے متعلق تخلیقی انداز میں غور و فکر کرنے کے لیے تھی۔

2.1 عوامی خواہش (The will of the people)

دستور ساز اسمبلی کے ایک کمیونسٹ ممبر سومان تھلاہری کو دستور ساز اسمبلی کے بحث و مباحثہ کے اوپر برطانوی سامراجیت کا سیاہ ہاتھ لگا ہوا نظر آتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے خاص طور پر ممبران اور عام طور پر ہندوستانیوں سے سامراجی حکومت کے اثرات سے خود کو پوری طرح آزاد ہونے کے لیے اصرار کیا۔ 1946-47 کی سر دیوں میں جب اسمبلی میں بحث و مباحثہ جاری تھا انگریز ہندوستان میں تھے۔ جواہر لعل نہرو کی سربراہی میں عارضی حکومت کا نظم و نسق قائم تھا لیکن یہ حکومت صرف وائسرائے اور لندن میں موجود برطانوی حکومت کی نگرانی کے تحت امور انجام دے سکتی تھی۔ لاہری نے پوری طرح آگاہ کرنے کے لیے اپنے ساتھیوں سے فہمائش کی کہ دستور ساز اسمبلی انگریزوں کی بنائی ہوئی ہے اور وہ انگریزوں کے منصوبوں پر مصروف کار ہے جیسا کہ انگریز ان کو پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتے ہیں۔



شکل 15.6

عارضی حکومت کے ممبران
راجندر پرساد مرکز میں، ساتھ ان کی دائیں جانب جواہر لعل نہرو اور بائیں جانب سردار ٹیل بیٹھے ہوئے ہیں اور بائیں جانب انتہائی آخر میں بھیم راؤ امبیڈکر اور دائیں جانب انتہائی آخر میں شیاما پرساد مکھرجی بیٹھے نظر آ رہے ہیں۔

”بہت خوب، جناب — جرأت مند الفاظ، باوقار الفاظ“

(“That is very good, Sir – bold words, noble words”)

سومنا تھ لاہری نے کہا تھا:

ٹھیک، جناب، میں پنڈت نہرو کو اس بات کے لیے مبارکباد دینا چاہتا ہوں کہ انھوں نے ہندوستانیوں کے طرز فکر و احساس کو عمدہ پیرائے میں بیان کیا، جب انھوں نے کہا کہ ہندوستانی لوگ، انگریزوں کے ذریعہ عائد کی گئی کوئی بھی بات قبول نہیں کریں گے۔ عائد کرنے کے اس طرح کے عمل پر اعتراض اور ناراضگی کا اظہار کیا جائے گا۔ انھوں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر ضرورت ہوئی تو ہم جدوجہد کی وادی میں سیر کریں گے۔ بہت خوب، جناب — جرأت مند الفاظ، باوقار الفاظ۔

لیکن غور کرنے کا نکتہ یہ ہے کہ اس چیلنج کو آپ کب اور کس طرح بروئے کار لانے جارہے ہیں۔ ٹھیک ہے، جناب، معاملہ یہ ہے کہ عائد کرنے کا عمل یہاں کیا جا رہا ہے، نہ صرف برطانوی منصوبے نے مستقبل کا کوئی دستور بنادیا ہے..... جو انگریزوں کے لیے اطمینان بخش معاہدے پر منحصر ہوگا بلکہ یہ اشارہ کرتا ہے کہ ہر چھوٹے سے چھوٹے اختلاف کے لیے آپ کو وفاقی عدالت (Federal court) تک دوڑنا ہوگا یا وہاں انگریزوں میں حاضر ہو کر ناچنا ہوگا یا برطانوی وزیراعظم کلیمنٹ اٹلی (Clement Attlee) یا کسی اور کو پکارنا ہوگا۔ صرف یہی حقیقت نہیں ہے۔ ہم منصوبوں کی جو بھی تدبیر سوچیں، اس دستور ساز اسمبلی کے تحت برطانوی ہندوؤں، برطانوی فوج اور ان کی معاش و مالیاتی جان لیوا عفریت کے سائے میں ہیں جس کا مطلب ہے کہ فیصلہ کن اقتدار بھی انگریزوں کے ہاتھ میں رہے گا اور اقتدار کا سوال ابھی تک حتمی طور پر طے نہیں ہوا ہے جس کا مطلب ہے کہ مستقبل ابھی تک پوری طرح ہمارے ہاتھوں میں نہیں ہے، نہ صرف یہ بلکہ حال ہی میں اٹلی اور دیگر افراد کے ذریعہ دیے گئے بیانات سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ، حتیٰ کہ آپ کو پورے طور سے تقسیم کرنے کی دھمکی دیں گے۔ اس کے معنی ہیں جناب کہ اس ملک میں کوئی آزادی نہیں ہے۔ جیسا کہ کچھ دنوں قبل سردار ولہ بھائی پٹیل نے کہا تھا، ہمارے پاس صرف آپس میں لڑنے کی آزادی ہے۔ ہم صرف اتنی ہی آزادی حاصل کر پائے ہیں..... اس لیے ہماری عاجزانہ تجویز ہے کہ سوال اس منصوبے کی تفصیلات کی توضیح کے ذریعہ کچھ حاصل کرنے کا نہیں ہے بلکہ یہاں اور ابھی آزادی کا اعلان، عبوری حکومت اور ہندوستان کے لوگوں سے اپیل کرنے، برادر کشی کی جنگ و جدل کو روکنے اور اپنے دشمن کے خلاف تیار رہنے جس کے ہاتھ میں ابھی تک چابک ہے یعنی برطانوی سامراجیت کو دیکھنے کا ہے اور باہم مل کر اس سے لڑنے کے لیے آگے بڑھیں اور اس کے بعد جب ہم آزاد ہو جائیں گے تو بعد ازاں ہم اپنے دعوؤں کو طے کر لیں گے۔

سی اے ڈی، جلد اول

نہرو نے اعتراف کیا کہ زیادہ تر قوم پرست لیڈران ایک مختلف قسم کی دستور ساز اسمبلی چاہتے ہیں۔ ایک معنی میں یہ صحیح بھی تھا کہ برطانوی حکومت ”کا اس کے ظہور میں ہاتھ تھا“ اور اس نے اسمبلی کے اندر کارگزاری کے لیے یقینی شرائط عائد کر دی تھیں۔ ”لیکن“ نہرو نے اصرار کے ساتھ کہا ”آپ کو اس ماخذ کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جس سے یہ اسمبلی اپنی طاقت اخذ کر رہی ہے۔“ نہرو نے مزید اضافہ کیا:

© ماخذ 2 میں مقرر کو ایسا کیوں لگتا ہے کہ دستور ساز اسمبلی برطانوی ہندوؤں کے سائے میں کام کر رہی ہے؟

حکومتیں، ریاستی کاغذات سے وجود میں نہیں آئیں۔ فی الحقیقت حکومتیں لوگوں کی خواہش کا اظہار ہوتی ہیں۔ آج ہم یہاں آپس میں مل رہے ہیں کیونکہ ہمارے پیچھے لوگوں کی طاقت ہے اور ہم اتنی ہی دور جاپائیں گے جتنی دور لوگ ہمیں لے جانا چاہیں گے۔ کسی پارٹی یا گروپ کے نہیں بلکہ مجموعی لحاظ سے لوگ.... ہماری خواہش ساتھ چلنے کی ہوگی۔ اس لیے ہمیں ہندوستانی عوام کے دلی جذبات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا ہوگا اور انہیں پورا کرنے کوشش کرنی ہوگی۔

شکل 15.7

ایڈو ن مونٹیگرو 1919 کے چیئرمین۔ فورٹ اصلاحات کے بانی تھے۔ جس میں صوبائی قانون ساز اسمبلیوں میں کسی حد تک نمائندگی کی اجازت دی گئی تھی۔



دستور ساز اسمبلی سے ان لوگوں کی خواہشات کے اظہار کی لیے توقع کی جاتی تھی جنہوں نے آزادی کے لیے تحریک میں حصہ لیا تھا۔ انیسویں صدی کے بعد سے ہندوستان میں جمہوریت، مساوات اور انصاف جیسے نصب العین سماجی جدوجہد کے ساتھ گہرے طور پر وابستہ ہو گئے تھے۔ جب انیسویں صدی میں سماجی مصلحین نے بچپن کی شادی کی مخالفت کی اور بیوہ کو دوسری شادی کرنے کی اجازت دینے کا مطالبہ کیا تو وہ سماجی انصاف کے لیے ہی پیروی کر رہے تھے۔ جب سوامی وویکانند نے ہندو مذہب کی اصلاح کے لیے ہم چلائی تو وہ مذاہب کو زیادہ انصاف پر مبنی بنانا چاہتے تھے۔ جب مہاراشٹر میں جیوتی باپھو لے نے پسماندہ ذاتوں کی نکالیف کی طرف توجہ دلائی یا جب کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں نے مزدوروں اور کسانوں کو منظم کیا تو وہ بھی معاشی اور سماجی انصاف کا مطالبہ کر رہے تھے۔ برطانوی حکومت کے خلاف جسے ایک ظالمانہ اور ناجائز حکومت کے طور پر دیکھا جاتا تھا قومی تحریک ناگزیر طور پر جمہوریت اور انصاف، شہریوں کے حقوق اور مساوات کے لیے بھی ایک جدوجہد تھی۔

فی الحقیقت، جوں جوں نمائندگی کے لیے مطالبہ بڑھا، انگریزوں کو مجبوراً دستوری اصلاحات کا ایک سلسلہ متعارف کرانا پڑا۔ صوبائی حکومتوں میں ہندوستانیوں کی شرکت بڑھانے کے لیے بتدریج کئی قوانین (ایکٹ) (1909، 1919 اور 1935) پاس کیے گئے۔ 1919 میں انتظامیہ کو جزوی طور پر صوبائی قانون ساز اداروں کے تئیں جوابدہ بنایا گیا اور 1935 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت اسے تقریباً پوری طرح قانون ساز اداروں کے تئیں جوابدہ بنایا گیا۔ جب 1937 میں گورنمنٹ آف انڈیا کے تحت الیکشن منعقد ہوئے تو گیارہ میں سے آٹھ صوبوں میں کانگریس اقتدار میں آگئی۔

تاہم، پہلے کے آئینی ارتقا اور 1946 سے آگے کے تین سالوں کے دوران وقوع پذیر واقعات کے درمیان الٹو تسلسل کے طور پر نہیں دیکھنا چاہیے۔ حالانکہ پہلے کے آئینی تجربات ایک نمائندہ حکومت کے لیے بڑھتے مطالبے کے جواب میں تھے۔ مختلف ایکٹ (1909، 1919 اور 1935) ہندوستانیوں کے ذریعہ راست طور پر تشکیل یافتہ بحث و مباحثہ کے بعد

پاس نہیں ہوئے تھے۔ انھیں نوآبادیاتی حکومت کے ذریعہ ہی نافذ کیا گیا تھا۔ صوبائی اداروں کا انتخاب کرنے والے انتخابی حلقے کا دائرہ وقت کے ساتھ پھیلتا جا رہا تھا، لیکن 1935 میں یہ حق بالغ آبادی کے 15-10 فی صد حصے تک ہی محدود رہا۔ اس وقت تک عمومی بالغ رائے دہندگی نہ تھی۔ 1935 کے ایکٹ کے تحت منتخب شدہ قانون ساز ادارے نوآبادیاتی حکومت کے ڈھانچہ کے اندر ہی کام کر رہے تھے اور انگریزوں کے ذریعہ مامور کردہ گورنر کو جوابدہ تھے۔ 13 دسمبر 1946 کو نہرو جس بشارت کا خاکہ کھینچنے کی کوشش کر رہے تھے وہ ایک آزاد، خود مختار جمہوری ہندوستان کے دستور کی بشارت تھی۔

3. حقوق کی خاکہ بندی (DEFINING RIGHTS)

شہریوں کے خصوصی حقوق کی خاکہ بندی کس طرح کی جائے؟ کیا مظلوم گروہوں کو کوئی مخصوص حقوق ملنے چاہئیں؟ اقلیتوں کے کیا حقوق ہوں؟ فی الحقیقت کن کی خاکہ بندی بطور اقلیت کی جاسکتی ہے؟ جوں جوں دستور ساز اسمبلی کے ایوان میں بحث و مباحثہ آگے بڑھا ویسے ہی یہ صاف ہو گیا کہ ان سوالات کا کوئی جواب نہیں جس پر اجتماعی طور پر اسمبلی متفق ہو۔ ان سوالات کے جوابات خیالات کے ٹکراؤ اور ذاتی تصادم کے ڈرامہ کے ذریعہ ہی تشکیل پاسکے۔ اپنی افتتاحی تقریر میں نہرو نے ”لوگوں کی خواہش“ کی دہائی دی اور واضح کیا کہ دستور بنانے والوں کو ”عوام کے دلوں میں پوشیدہ جذبات و شوق“ کو پورا کرنا ہے۔ یہ آسان کام نہ تھا۔ آزادی کی امید کے ساتھ مختلف گروہ اپنی خواہشات مختلف انداز میں ظاہر کر رہے تھے اور اپنے مطالبے پیش کر رہے تھے۔ ان سب پر بحث و مباحثہ ضروری تھا اور عمومی اتفاق رائے پر بتدریج آگے بڑھنے سے قبل باہم مخالف تصورات کے لیے مفاہمت لازمی تھی۔

3.1 جداگانہ انتخابی حلقوں کا مسئلہ

(The problem with separate electorates)

27 اگست 1947 کو مدراس کے بی۔ پوکر بہادر نے جداگانہ انتخابی حلقے سلسل بنائے رکھنے کے لیے ایک مؤثر عذر خواہی پیش کی۔ بہادر نے دلیل پیش کرتے ہوئے کہا کہ اقلیتیں ہر ملک میں پائی جاتی ہیں۔ ہم انھیں چاہتے ہوئے بھی دور نہیں کر سکتے، ہم ان کی ہستی کو مٹا نہیں سکتے۔ ضرورت ایک ایسا سیاسی ڈھانچہ بنانے کی ہے جس میں اقلیتیں دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی سے رہ سکیں اور فرقوں کے درمیان اختلافات کو کم سے کم کیا جاسکے۔ یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب سیاسی نظام کے اندر اقلیتوں کو مناسب نمائندگی دی جائے، ان کے آواز سنی جائے اور ان کے خیالات کا لحاظ رکھا جائے۔ صرف جداگانہ انتخابی حلقوں سے ہی یہ یقینی ہوگا کہ مسلمان ملک کی



شکل 15.8

1946 کی سر دیوں میں ہندوستانی لیڈران انگلینڈ کے وزیر اعظم اٹیلی کے ساتھ تبادلہ خیال کرنے لندن گئے تھے کئی دور کی یہ گفتگو بے نتیجہ ثابت ہوئی (بائیں سے دائیں: لیاقت علی، محمد علی جناح، بلدیو سنگھ اور پینتھک لارنس)

حکومت میں بامعنی رائے رکھتے ہیں۔ بہادر محسوس کرتے تھے کہ مسلمانوں کی ضرورتوں کو غیر مسلم مناسب انداز میں نہیں سمجھ سکتے، نہ ہی ان لوگوں کے ذریعہ مسلمانوں کی سچی نمائندگی ہو سکتی ہے جو اس فرقہ سے تعلق نہیں رکھتے۔

جداگانہ انتخابی حلقوں کے لیے اس مطالبہ نے زیادہ تر قوم پرست لیڈروں کے درمیان غصہ اور اضطراب پیدا کر دیا۔ بعد ازاں جذبات پر مبنی بحث و مباحثہ میں اس مطالبہ کے خلاف دلائل کا ایک سلسلہ پیش کیا گیا۔ زیادہ تر قوم پرست جداگانہ انتخابی حلقوں کو انگریزوں کے ذریعہ لوگوں کو تقسیم کرنے کے لیے دانستہ متعارف اقدام کے طور پر دیکھتے تھے۔ آر۔ وی۔ دھولیکرنے بہادر سے کہا تھا، ”انگریزوں نے تحفظ کرنے کے نام کے تحت اپنا کھیل کھیلایا۔ اس کی مدد سے انھوں نے ایک طویل جھوٹی تسلی دینے کے لیے تم (اقلیتوں) کو بھایا تھا۔ اس کو اب چھوڑ دو..... اب یہاں کوئی تم کو گمراہ کرنے والا نہیں ہے۔“

جداگانہ انتخابی حلقوں کا تصور تقسیم کی وجہ سے قوم پرستوں کے لیے شدت سے مخالفت کا سبب بنا۔ مسلسل خانہ جنگی، فسادات اور تشدد کا خوف ان کے ذہن میں عود کر آیا۔ سردار پٹیل نے واضح کیا کہ ”جداگانہ انتخابی حلقے ایک زہر تھا جو ہمارے ملک کے سیاسی جسم میں داخل ہو چکا ہے۔“ ایک ایسا مطالبہ تھا جس نے ایک فرقہ کو دوسرے فرقے کے خلاف کر دیا۔ ملک تقسیم ہو گیا، خون افشانی کا سبب بنا اور ملک کی الناک تقسیم کے لیے وجہ بنا۔ پٹیل نے تاکید کی ”کیا آپ اس ملک میں امن چاہتے ہیں؟ اگر چاہتے ہیں تو اسے (جداگانہ انتخابی حلقوں کو) دور ہٹاؤ۔“

ماخذ 3

”انگریز (غصہ) تو چلے گئے، لیکن اپنے پیچھے شرارت چھوڑ گئے“

(“The British element is gone, but they have left the mischief behind”)

سردار دلچھ بھائی پٹیل نے کہا تھا:

یہ دہرانے کا کوئی فائدہ نہیں کہ ہم جداگانہ انتخابی حلقوں کے لیے مانگ اس لیے کر رہے تھے کیونکہ یہ ہمارے لیے اچھا ہے۔ یہ بات ہم بہت عرصے سے سن رہے ہیں۔ ہم سالوں سے یہ سن رہے ہیں کہ اس احتجاج کے نتیجے میں اب ہم علاحدہ ملک ہیں..... کیا آپ مجھے ایک بھی آزاد ملک دکھا سکتے ہیں جہاں جداگانہ انتخابی حلقے ہوں؟ اگر آپ مجھے دکھادیں تو میں آپ کی بات ماننے کے لیے تیار ہوں، لیکن اس بد قسمت ملک میں حتیٰ کہ ملک کی تقسیم کے بعد بھی اس جداگانہ انتخابی حلقہ کو قائم اور جاری رکھا گیا تو ملک کی شامت آجائے گی، یہاں رہنے کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ یہ صرف میرے لیے ہی اچھا نہیں ہے بلکہ یہ آپ کے لیے بھی اچھا ہے، میں کہتا ہوں ماضی کو بھول جاؤ۔ ایک دن ہم متحد ہو سکتے ہیں..... انگریز (غصہ) تو چلے گئے، لیکن اپنے پیچھے شرارت چھوڑ گئے۔ ہم اس شرارت کو دوام دینا نہیں چاہتے۔ (سنیے سنیے) جب انگریزوں نے یہ غصہ متعارف کرایا تھا تو انہیں یہ توقع نہیں تھی کہ اتنی جلدی جان پڑے گا۔ وہ اپنے نظم و نسق کی آسانی کے لیے یہ چاہتے تھے۔ ٹھیک ہے، لیکن اب وہ اپنی وراثت پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ اب ہم اس سے باہر نکلیں گے یا نہیں؟

سی اے ڈی جلد V

جداگانہ انتخابی حلقوں کے لیے مطالبہ کا جواب دیتے ہوئے گوندولہ پنت نے واضح کیا کہ یہ نہ صرف ملک کے لیے بلکہ اقلیتوں کے لیے بھی نقصان دہ ہے۔ انھوں نے بہادر کے ساتھ اس بات پر اتفاق کیا کہ جمہوریت کے تین مختلف طبقات کے لوگوں کے درمیان پیدا ہوئے یقین کے ذریعہ ہی جمہوریت کی کامیابی کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ وہ اس بات پر بھی متفق تھے کہ ایک آزاد ریاست میں ہر شہری کے ساتھ ایسے انداز میں پیش آنا چاہیے جس سے نہ صرف اس کی مادی ضروریات بلکہ عزت نفس کے روحانی شعور سے بھی وہ مطمئن ہو جائے اور اکثریتی طبقہ کا فرض ہے کہ وہ اقلیتوں کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کرے اور ان کی خواہشات کے ساتھ ذہنی ہمدردی سے کام لے۔ تاہم پنت جداگانہ انتخابی حلقوں کے تصور کی مخالفت کر رہے تھے۔ ان کی دلیل تھی کہ یہ ایک خودکشی پر مائل مطالبہ تھا، جو اقلیتوں کو مستقل بنیادوں پر جد کر دے گا، انھیں عاجز بنا دے گا اور حکومت کے اندر انھیں کسی طرح کی موثر شرکت نہیں مل پائے گی۔

ماخذ 4

”میرا یقین ہے کہ جداگانہ انتخابی حلقے اقلیتوں کے لیے خودکشی پر مائل ثابت ہوں گے“
 (“I believe separate electorates will
 be suicidal to the minorities”)

27 اگست 1947 کو بحث و مباحثہ کے دوران گوندولہ پنت نے کہا تھا:

میرا یقین ہے کہ جداگانہ انتخابی حلقے اقلیتوں کے لیے خودکشی پر مائل ثابت ہوں گے اور انھیں زبردست نقصان ہوگا۔ اگر انھیں ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا گیا تو وہ کبھی خود کو اکثریت میں تبدیل نہیں کر سکیں گے، اور یہاں کہ انھیں بالکل شروع سے ہی محرومی و مایوسی کا احساس اپنا بیج بنا دے گا۔ کیا یہ آپ کی خواہش ہے اور ہمارا حتمی مقصد کیا ہے؟ کیا اقلیتیں ہمیشہ اقلیتیں ہی بنی رہنا چاہتی ہیں یا وہ ایک عظیم ملک کا جزو لازم بننا اور اس کی قسمت کو راہ دکھانے اور کنٹرول کرنے کی توقع رکھنا چاہتی ہیں؟ اگر وہ بقیہ فرقے سے الگ رہتی ہیں، اگر وہ ایسا کرتی ہیں تو وہ ہمیشہ اس خواہش اور نصب العین کو حاصل کر سکتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر انھیں بقیہ فرقے سے علاحدہ کیا جاتا ہے اور ایک ہوا بند گوشے میں الگ رکھا جاتا ہے جہاں انھیں زندہ رہنے کے لیے ہوا پر بھی حتیٰ کہ دوسروں پر پھروسہ کرنا پڑے گا تو یہ ان کے لیے انتہائی خطرناک ہوگا..... اگر اقلیتیں جداگانہ انتخابی حلقوں سے منتخب ہوتی رہیں تو کبھی بھی کوئی موثر رائے نہیں بن سکتی۔

سی اے ڈی، جلد دوم

© ماخذ 3 اور 4 کو پڑھیے۔ جداگانہ انتخابی حلقوں کے خلاف کون کون سے مختلف دلائل پیش کیے گئے۔

ماخذ 5

”منقسم وفاداری کے لیے کوئی جگہ نہیں ہو سکتی“
 (“There cannot be any
 divided loyalty”)

گووندہ لہ پنت نے دلیل دی کہ وفادار شہری بننے کے تعلق سے لوگوں کو صرف فرقہ اور خود پر مرکوز سوچنے کا عمل بند کرنا ہوگا:

جمہوریت کی کامیابی کے لیے فرد کو خود ضبط نفس میں تربیت لینا ہوگی۔ جمہوریت میں فرد کو خود اپنے لیے اور دوسروں کے لیے زیادہ فکر کرنی ہوگی، منقسم وفاداری کے لیے کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ تمام طرح کی وفاداریاں ریاست کے ارد گرد مرکوز ہونی چاہئیں۔ اگر جمہوریت میں آپ حریف وفاداریاں پیدا کریں یا آپ ایک ایسا نظام بنادیں جس میں کوئی فرد یا گروہ اپنے اسراف پر روک لگانے کے بجائے وسیع یا دیگر مفادات کے لیے کچھ پرواہ نہیں کرے تو پھر جمہوریت کا انجام دہشت ناک ہے۔

سی اے ڈی، جلد دوم

جی۔ بی۔ پنت ایک وفادار شہری کی خصوصیت کی کس طرح توضیح کرتے ہیں؟

ان تمام دلائل کے پیچھے ایک متحدہ ریاست کی تشکیل کی تشویش وابستہ تھی بغرض سیاسی اتحاد تعمیر کرنے اور ملک بنانے کے لیے ہر فرد کو ریاست کے شہری کے طور پر ڈھالنا ضروری تھا۔ ہر گروہ کو ملک کے اندر ضم کرنا لازمی تھا۔ آئین شہریوں کو حقوق عطا کرے گا لیکن شہریوں کو بھی ریاست کے تئیں اپنی وفاداری پیش کرنی ہوگی۔ فرقوں کو بحیثیت ثقافتی انفرادیت کے تسلیم کیا جاسکتا ہے اور ثقافتی حقوق کی یقین دہانی دی جاسکتی ہے تاہم سیاسی طور پر تمام فرقوں کے ممبران کو ریاست کے مساوی ممبران کے طور پر کام کرنا ہوگا ورنہ ان کی وفاداریاں تقسیم ہو جائیں گی۔ پنت نے کہا کہ اس لحاظ سے یہ مخرب اخلاق اور کسی حد تک ذلیل و خوار کرنے والی عادت ہے کہ ہم کبھی بھی ایک شہری کے طور پر نہیں سوچتے اور ہمیشہ ایک فرقے کے طور پر ہی سوچتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا ”ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ“ یہ شہریت ہی ہے جو ہمیشہ شمار ہوتی ہے یہ شہریت ہی ہے جو سماجی اہرام کی بنیاد بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ جوٹی بھی ہے“ حتیٰ کہ جب جماعتی حقوق (Community Rights) کی اہمیت کو تسلیم کیا جا رہا تھا اس وقت بہت سے قوم پرستوں میں موہوم سا خوف موجود تھا کہ یہ وفاداریوں کی تقسیم کی بنیاد بن سکتا ہے اور یہ ایک مضبوط ملک اور طاقتور ریاست کو تعمیر کرنا مشکل کر سکتا ہے۔

سارے مسلمان جداگانہ انتخابی حلقوں کے لیے مطالبہ کی حمایت نہیں کر رہے تھے۔ مثال کے طور پر بیگم اعجاز رسول محسوس کرتی تھیں کہ جداگانہ انتخابی حلقے مائل بہ خودکشی ثابت ہوں گے چونکہ وہ اقلیتوں کو اکثریت سے الگ کر دیں گے۔ 1949 تک دستور ساز اسمبلی کے زیادہ تر مسلم ممبران اس بات پر متفق ہو گئے کہ جداگانہ انتخابی حلقے اقلیتوں کے مفادات کے خلاف ہیں۔ اس کے بجائے مسلمانوں کو سیاسی عمل میں سرگرم حصہ لینے کی ضرورت ہے جو سیاسی نظام میں ان کی فیصلہ کن رائے کو یقینی بنائے۔

3.2 ”اس قرارداد کی بجائے ہمیں زیادہ کی ضرورت ہے“ (“We will need much more than this Resolution”)

اگرچہ ”اہداف قرارداد“ کا استقبال کرتے ہوئے ایک سوشلسٹ این۔ جی۔ رنگا نے جو کسان تحریک کے لیڈر تھے اصرار کیا کہ اصطلاح اقلیت کی ترجمانی معاشی اصطلاح میں ہونی چاہیے۔ رنگا کے لحاظ سے اصلی اقلیتیں غریب اور ظلم و استبداد کے شکار لوگ تھے۔ انھوں نے اس بات کا استقبال کیا کہ دستور میں ہر فرد کے لیے قانونی حقوق دیے جا رہے ہیں لیکن انھوں نے اس کی محدود بات کو بھی نشان زد کیا تھا۔ اس رائے میں گاؤں میں غریب لوگوں کے لیے یہ جاننا بے معنی تھا

کہ ان کے پاس زندہ رہنے کے لیے، مکمل روزگار کے لیے بنیادی حق ہے۔ وہ اپنے جلسے، کانفرنسیں کر سکتے ہیں، اپنی تنظیم بنا سکتے ہیں اور ان کے پاس دیگر شہری آزادیاں بھی ہیں۔ یہ ضروری تھا کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں جہاں عوام دیے گئے ان دستوری حقوق سے مؤثر ڈھنگ سے استفادہ کر سکیں۔ اس کے لیے انھیں تحفظ کی ضرورت تھی۔ رنگا نے کہا، ”انھیں سہارا کی ضرورت ہے، انھیں زمین کی ضرورت ہے“

ماخذ 6

”اصلی اقلیتیں اس ملک کے عوام ہیں“ (“The real minorities are the masses of this country”)

جواہر لعل نہرو کے ذریعہ پیش کی گئی اہداف قرار داد کا استقبال کرتے ہوئے این۔ جی۔ رنگا نے کہا تھا: جناب، یہاں اقلیتوں کے متعلق بہت باتیں ہوئی ہیں۔ اصلی اقلیتیں کون ہیں؟ نام نہاد پاکستان کے صوبوں میں رہنے والے ہندو، سکھ اور حتیٰ کہ مسلمان بھی اقلیت نہیں ہیں۔ نہیں جناب اصلی اقلیتیں اس ملک کے عوام ہیں۔ یہ لوگ اب تک اسٹن پریشان، مظلوم و محکوم اور دبے کپڑے میں کہ وہ عام شہری حقوق کا فائدہ اٹھانے کے بھی اہل نہیں ہیں۔ حالت کیا ہے؟ آپ قبائلی علاقوں میں جائیے۔ قانون کے مطابق، ان کے اپنے روایتی قانون، ان کے قبائلی قانون ان کی زمینوں سے خارج نہیں کر سکتے۔ تاہم ہمارے تاجر وہاں جاتے ہیں اور نام نہاد آزاد بازار کے نام پر ان کی زمین چھین لینے کے اہل ہیں۔ اس طرح گوکہ قانون ان کی زمینوں کے ایسے چھیننے کے خلاف جاتا ہے۔ ابھی تک تاجر اس بات کے اہل ہیں کہ وہ قبائلی لوگوں کو مختلف قسم کے معاہدوں کے ذریعہ صحیح معنی میں غلام بنا لیتے ہیں۔ آئیے اب عام گاؤں والوں کی طرف چلتے ہیں۔ یہاں تاجر اپنی دولت کے ساتھ جاتا ہے اور وہ گاؤں والوں کو اپنی جیب میں ڈال لیتا ہے۔ یہاں بذات خود زمین مالکان، زمین دار اور مال گزار موجود ہیں اور مختلف قسم کے دیگر لوگ ہیں جو ان غریب گاؤں والوں کا استحصال کرنے کے اہل ہیں۔ یہاں ان لوگوں میں بنیادی تعلیم بھی نہیں ہے۔ یہی اصلی اقلیت ہیں جنھیں تحفظ اور اس کی یقین دہانی کی ضرورت ہے۔ ان لوگوں کو لازمی تحفظ دینے کے نام پر ہمیں اس قرارداد سے کہیں زیادہ کرنے کی ضرورت ہوگی....

سی اے ڈی۔ جلد دوم

رنگا کے ذریعہ اقلیت کے تصور کی توضیح
کس طرح کی گئی ہے؟

رنگا نے ہندوستانی عوام اور دستور ساز اسمبلی میں ان کے نمائندہ کے طور پر بولنے کا دعویٰ کرنے والے افراد کے بیچ موجود خلیج جو وسیع طور پر علاحدہ کرتی ہے، کی طرف بھی لوگوں کی توجہ مبذول کرائی:

ہم کن لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں؟ ہمارے ملک کے عام عوام اور اس کے باوجود ہم میں سے زیادہ تر لوگ بذات خود اس عوام سے تعلق نہیں رکھتے۔ ہم ان کے ہیں، ہم ان کے لیے نمائندگی کرنا چاہتے ہیں لیکن عوام بذات خود دستور اسمبلی میں آنے کے اہل نہیں ہے، اس میں ابھی وقت لگ سکتا ہے، ان کی پرزور حمایت کرنے والوں کے طور پر ہم ان کے لیے آواز اٹھانے کی اپنی بہترین کوششیں کر رہے ہیں۔

رنگا کے ذریعہ مذکورہ گروہوں میں قبائل بھی ایک تھے، اسمبلی کے لیے ان نمائندوں میں غیر معمولی طور پر ذہین مقرر بے پال سنگھ تھے۔ اہداف قرارداد کا استقبال کرتے ہوئے بے پال سنگھ نے کہا تھا۔

ایک آدمی واپسی کے طور پر اس قرارداد کی قانونی پیچیدگیوں کی فہم کی امید نہیں رکھتا، لیکن میری عام سمجھ بوجھ کہتی ہے کہ ہم میں سے ہر ایک شخص کو آزادی کے اس راستے پر چلنا چاہیے اور مل کر لڑنا چاہیے۔ جناب اگر یہاں ہندوستانی لوگوں کا کوئی گروہ ہے جس کے ساتھ سو فیصد سلوک کیا گیا ہے تو وہ میرے لوگ ہیں۔ ان سے گزشتہ 60,000 سالوں سے ذلت آمیز سلوک کیا گیا ہے اور انھیں نظر انداز کیا گیا ہے۔ میرے لوگوں کی پوری تاریخ ہندوستان کے غیر حقیقی باشندوں کے ذریعہ مسلسل استحصال اور بے دخلی کی تاریخ ہے، بغاوتوں اور انتشار کے ذریعہ یہ سلسلہ ٹوٹا ہے۔ تاہم میں پنڈت جواہر لعل نہرو کے الفاظ سمجھ گیا۔ میں آپ سب کی بات سمجھ گیا کہ اب ہم نیا باب شروع کرنے جا رہے ہیں۔ آزاد ہندوستان کا ایک باب جہاں مواقع کے مساوی امکان ہوں گے جہاں کوئی بھی فرد نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔

سنگھ نے واضح انداز میں قبائل کے تحفظ اور ان حالات کو یقینی بنانے کے لیے جو عام آبادی کی سطح تک لانے میں معاون ہو سکتے ہیں، کی ضرورت پر تقریر کی۔ انھوں نے دلیل دی کہ قبائل اعدادی بنیادی پر اقلیت نہیں تھے لیکن انھیں تحفظ کی ضرورت ہے۔ انھیں زمین سے بے دخل کر دیا گیا جہاں وہ مقیم تھے۔ انھیں ان کے جنگلات اور چراگا ہوں سے محروم کر دیا گیا اور نئے گھروں کی تلاش میں حرکت کرنے کے لیے مجبور کیا گیا۔ انھیں قدیم دور کا (غیر ترقی یافتہ) اور پسماندہ کی طرح دیکھتے ہوئے بقیہ سماج نے ان سے رخ موڑ لیا اور ٹھکرا دیا۔ انھوں نے جذباتی اور مادی فاصلہ جو قبائلی کو بقیہ سماج سے علاحدہ کرتا ہے کو توڑنے کے لیے دلیل پیش کرتے ہوئے کہا ”ہمارا نقطہ نظریہ ہے کہ آپ کو ہمارے ساتھ ربط ضبط رکھنا چاہیے۔ ہم آپ کے ساتھ ربط ضبط رکھنے کے خواہش مند ہیں۔۔۔۔۔ سنگھ جداگانہ انتخابی حلقوں کے لیے نہیں کہہ رہے تھے لیکن وہ محسوس کرتے تھے کہ قانون ساز اداروں میں قبائلیوں کو بذات خود نمائندگی کے لیے سیٹوں کو محفوظ کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ قبائلیوں کی آواز سننے کے لیے دوسروں کو ان کے قریب آنے کے لیے مجبور کرنے کے لیے یہ ایک راستہ ہوگا۔

3.3 ”ہم ہزاروں سال سے دبے کچلے تھے“ (“We were suppressed for thousands of years”)

دستور کے ذریعہ پسماندہ ذاتوں کے حقوق کی توضیح کس طرح کی جائے؟ قومی تحریک کے دوران امبیڈکر نے پسماندہ ذاتوں کے لیے جداگانہ انتخابی حلقوں کا مطالبہ کیا تھا اور گاندھی جی نے یہ دلیل دیتے ہوئے اس مطالبہ کی مخالفت کی تھی کہ یہ مطالبہ ہمیشہ کے لیے بقیہ سماج سے پسماندہ ذاتوں کو علاحدہ کر دے گا۔ دستور ساز اسمبلی اس مخالفت کو کس طرح حل کر سکتی تھی؟ پسماندہ ذاتوں کو کس قسم کا تحفظ مہیا کرایا جاسکتا تھا؟

ماخذ 7

”ہم اپنی سماجی مجبوری و لا چاری کو ہٹانا چاہتے ہیں“
 (“We want removal of our social disabilities”)

مدرس کی دکشانی ویلا یوہن نے دلیل دی:
 ہم کو ہر قسم کے حفظ ما تقدم نہیں چاہئیں۔ یہ اخلاقی
 حفظ ما تقدم ہے جو اس ملک کے ستم رسیدہ لوگوں کو
 تحفظ دے گا..... میں یہ ماننے سے انکار کرتی ہوں
 کہ سات کروڑ ہریجنوں کو ایک اقلیت تسلیم کیا جائے
 ہم چاہتے ہیں کہ ہماری سماجی مجبوری و لا چاری
 کو فوراً ختم کیا جائے۔

پسماندہ ذاتوں کے چند ممبران نے اصرار کیا کہ اچھوتوں کا مسئلہ صرف تحفظ اور حفظ ما تقدم کے ذریعہ ہی حل نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی مجبوری و لا چاری، سماجی معیارات اور ذات پات پر مبنی سماج اخلاقی اقدار کے سبب تھی۔ سماج نے ان کی خدمات اور محنت کا استعمال تو کیا ہے لیکن اس سے ایک سماجی فاصلہ برقرار رکھا ہے، ان کے ساتھ ربط و ضبط یا ان کے ساتھ کھانا کھانے سے انکار کرتے ہیں یا ان کو مندروں میں داخل ہونے نہیں دیا جاتا۔ مدراس سے تعلق رکھنے والے ممبر جے ناگپانے کہا تھا: ہم ہمیشہ تکلیف اٹھاتے رہے لیکن اب مزید تکلیف اٹھانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ہم نے اپنی ذمہ داریاں اچھی طرح سمجھ لی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہم کو کس طرح اصرار کرنا ہے۔“

ناگپانے نشاندہی کی کہ اعدادی بنیاد پر پسماندہ ذاتیں اقلیت نہیں ہیں: وہ کل آبادی کو 20 اور 25 فی صد کے درمیان تشکیل کرتے ہیں۔ ان کی تکلیف کا سبب منظم طریقے پر حاشیہ پر رکھنا تھا نہ کہ ان کی اعدادی بے اہمیت تھی۔ ان کے پاس نہ تو تعلیم تک رسائی تھی نہ ہی انتظامیہ میں حصہ داری۔ مرکزی صوبہ جات کے ممبر کے۔ جے۔ کھانڈیکر نے اسمبلی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

ہم ہزاروں سال سے دبے کچلے تھے..... دبایا گیا..... اس حد تک دبایا گیا کہ نہ ہی ہمارا دماغ
 اور نہ ہی ہمارے جسم اور اب حتیٰ کہ ہمارے دل بھی کام نہیں کرتے، نہ ہی ہم آگے بڑھنے کے قابل
 رہ گئے ہیں۔ یہ ہے حالت ہماری۔

تقسیم ملک کے تشدد کے بعد، امبیڈکر نے بھی جداگانہ انتخابی حلقوں کے لیے دلیل دینا بند کر دی۔ دستور ساز اسمبلی نے بالآخر یہ سفارش کی کہ چھوٹ چھات کو ختم کیا جائے۔ ہندو مندروں کو تمام ذاتوں کے لوگوں کے لیے کھول دیا جائے اور خلی ذاتوں کے افراد کے لیے قانون ساز اداروں اور سرکاری دفاتر میں نوکریوں میں نشستیں محفوظ کی جائیں۔ بہت سے لوگوں کا ماننا تھا کہ

ماخذ 8

”ہم نے کبھی بھی خصوصی مراعات نہیں مانگیں“
(We have never asked
for privileges)

بمبئی کی ہنس نے مہینہ خواتین کے لیے انصاف کا مطالبہ کیا
اور محفوظ سیٹوں یا جدا گانہ انتخابی حلقہ کا مطالبہ نہیں کیا:

ہم نے کبھی بھی خصوصی مراعات نہیں مانگیں ہم نے
سماجی انصاف، معاشی انصاف اور سیاسی انصاف
کے لیے مطالبہ کیا ہے ہم نے اس برابری کا مطالبہ
کیا ہے جس سے صرف باہمی عزت اور فہم کی بنیاد
بن سکتی ہے جس کی بنا پر مرد اور عورت کے درمیان
حقیقی باہمی تعاون ممکن نہیں ہے۔

اس سے بھی تمام مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ سماجی تفریق کو صرف آئینی قوانین کے ذریعہ نہیں مٹایا جاسکتا، اس کے لیے سماج کے اندر رویوں میں تبدیلی لانی ہوگی، لیکن جمہوری عوام کے ذریعہ ان اقدامات کا خیر مقدم کیا گیا۔

بحث کیجیے

مختلف دلائل کیا تھے جو بے پال نگہ نے قباکوں کے لیے تحفظ جاتی اقدامات کا مطالبہ کرتے ہوئے پیش کیے تھے؟

4. ریاست کے اختیارات

(THE POWERS OF THE STATE)

دستور ساز اسمبلی میں نہایت قوی اور فعال بحث و مباحثہ کے موضوعات میں ایک موضوع مرکزی حکومت اور ریاستی حکومتوں کے حقوق کے متعلق تھا۔ جو لوگ مضبوط مرکزی حکومت کے قائل تھے ان میں جواہر لعل نہرو بھی تھے جیسا کہ انھوں نے دستور ساز اسمبلی کے صدر کے نام لکھے خط میں واضح کیا تھا ”اب جب تقسیم ملک ایک طے شدہ حقیقت ہے..... ایک کمزور مرکزی اقتدار ملک کے مفادات کے لیے نقصان دہ ہوگا جو امن و امان کو یقینی بنانے، مشترکہ عام اندیشوں کے ناگزیر معاملات کو ہم آہنگ کرنے اور بین الاقوامی دائرہ عمل میں پورے ملک کے لیے موثر طور پر آواز اٹھانے میں نااہل ہوگا۔“

دستور کے مسودہ میں موضوعات کی تین فہرست تیار کی گئی تھی۔ مرکزی (Union)، ریاستی اور باہم مربوط (Concurrent)۔ پہلی فہرست کے موضوع مرکزی حکومت کے لیے محفوظ کیے گئے تھے جب کہ دوسری فہرست میں موضوع ریاستوں کے اختیار سے متعلق تھے۔ تیسری فہرست مرکز اور ریاست کی مشترکہ ذمہ داری کی بابت تھی۔ تاہم دیگر وفاقیوں (Federations) کے مقابلے میں بہت زیادہ شقیں بلاشرکت غیرے مرکزی کنٹرول کے تحت رکھی گئی تھیں۔ صوبوں کی خواہشات کے مقابلے باہم مربوط فہرست میں بھی بہت زیادہ شقیں رکھی گئی تھیں۔ معدنیات اور کلیدی صنعتوں کا کنٹرول بھی مرکز کے پاس تھا۔ مزید برآں دفعہ 356 کے تحت گورنر کی سفارش پر مرکز کو ریاست کے نظم و نسق کو ہاتھ میں لینے کا اختیار دیا گیا تھا۔

مالیاتی وفاق پسندی کے پیچیدہ نظام کے لیے بھی دستور اختیار دیتا ہے۔ بعض معاملے میں (مثال کے طور پر کسٹم ڈیوٹی اور کمپنی ٹیکسوں) ٹیکسوں سے حاصل ہونے والی ساری رقم مرکز اپنے پاس رکھے گا۔ دوسرے معاملوں میں (جیسے آمدنی ٹیکس اور آبکاری ٹیکس) یہ آمدنی ریاستوں کے ساتھ تقسیم کر دی گئی۔ مزید دیگر معاملوں میں (مثلاً مٹر و کہ املاک پر لگایا جانے والا ٹیکس) پوری آمدنی ریاستوں کو تفویض کر دی گئی تھی۔ اس دوران ریاستیں اپنے طور پر معین ٹیکس عائد کر سکتی تھیں اور وصول کر سکتی تھیں۔ ان میں زمین اور ملکیت ٹیکس، فروخت ٹیکس اور بوتل بند شراب پر غیر معمولی منافع شامل ہیں۔

4.1 ”مرکز منتشر ہو سکتا ہے“

”(The centre is likely to break“)

ریاستوں کے حقوق کا سب سے زیادہ واضح دفاع مدراس کے ممبر کے۔ ساننھاتم نے کیا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ نہ صرف ریاستوں بلکہ مرکز کو بھی مضبوط بنانے کے لیے اختیارات کو از سر نو تقسیم کرنا ضروری تھا ”یہاں تقریباً ایک خیال ذہن پر طاری ہو گیا ہے کہ تمام قسم کے اختیارات کا اضافہ کرنے کے ذریعہ ہم مرکز مضبوط بنا سکتے ہیں“۔ ساننھاتم نے کہا کہ یہ غلط تصور تھا اگر مرکز ذمہ داریوں کے ساتھ زیادہ زیر بار تھا تو یہ مؤثر ڈھنگ سے کام نہیں کر سکتا۔ اس کے کچھ امور میں ذمہ داری کا بوجھ کم کرنے سے اور ریاستوں کو منتقل کر دینے سے فی الحقیقت مرکز کو مضبوط بنایا جاسکتا ہے۔

جہاں تک ریاستوں کا تعلق ہے ساننھاتم نے محسوس کیا کہ اختیارات کا مجوزہ طور پر مختص کرنا ان کو اپنا بیج بنادے گا۔ مالیاتی شقیں (انتظام) صوبوں کو مفلس بنادیں گی۔ چونکہ زمین مال گزاری کے علاوہ زیادہ تر ٹیکس مرکز کے لیے محفوظ کر دیے گئے تھے۔ بغیر مالیات کے ریاستیں ترقی کے منصوبوں کا بیڑا کس طرح اٹھا سکتی ہیں؟ ”میں ایسا کوئی دستور نہیں چاہتا جس میں اکائی کو آکر مرکز سے یہ کہنا پڑے کہ میں اپنے لوگوں کو تعلیم یافتہ نہیں بنا سکتا، میں انھیں کچرے اور گندے پانی کی نکاسی کا انتظام نہیں دے سکتا، مجھے سڑکوں کی اصلاح کے لیے، صنعتوں کے قیام کے لیے وظیفہ دے دیجیے۔ بہتر ہوگا کہ ہم وفاقی نظام کو نیست و نابود کریں اور اکائی والا نظام اختیار کریں“ ساننھا نم نے پیشن گوئی کی کہ اگر اختیارات کی مجوزہ تعلیم بغیر مزید تنقیدی نظر کے اختیار کی گئی تو مستقبل تاریک ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ چند سالوں میں سارے صوبے ”مرکز کے خلاف بغاوت“ میں اٹھ کھڑے ہوں گے۔

ماخذ 9

بہتر محبت وطن کون ہے؟

(Who is a better patriot?)

میسور کے سرائے۔ داماسوامی مدالیار نے 21 اگست

1947 کے بحث و مباحثہ کے دوران کہا تھا:

اگر ہم ایک مضبوط مرکز کی تجویز اس لیے کرتے ہیں کہ ہم بہتر محبت وطن ہیں اور یہ بات ہم اپنی روح کی خوشامدانہ تسکین کے لیے پیش نہیں کرتے اور وہ جو ان وسائل کی نہایت قوی اور فعال جانچ کی وکالت کرتے ہیں ان لوگوں میں قومی جذبے یا حب الوطنی کا فقدان ہے۔

صوبوں کے بہت سے دیگر ممبران بھی اس طرح کے خوف کی بازگشت سے پریشان تھے۔ انھوں نے جان توڑ کوشش کی کہ باہم مربوط اور یونین فہرستوں میں قلیل تعداد میں شقیں رکھی جائیں۔ اڑیسہ کے ایک ممبر نے خبردار کیا کہ ”مرکز منتشر ہو جائے گا“ چونکہ دستور کے تحت اختیارات بافراط مرکز کر دیے گئے تھے۔

4.2 ”آج ہمیں ایک طاقتور حکومت کی ضرورت ہے“ (”What we want

today is a strong Government”)

صوبوں کے لیے زیادہ اختیارات کی بابت دلائل نے اسمبلی کے اندر سخت رد عمل کے لیے اکسایا۔ دستور ساز اسمبلی کے اجلاس کی شروعات سے لے کر اب تک متعدد مواقع پر ایک مضبوط مرکز کی ضرورت کے لیے توجہ مبذول کرائی گئی۔ امبیڈکر نے اعلان کیا کہ وہ ”ایک مضبوط اور متحدہ مرکز (سنیے سنیے) ہم 1935 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت بنائے گئے مرکز کے مقابلے زیادہ مضبوط مرکز“ چاہتے ہیں۔ فسادات اور تشدد جس نے ملک کے ٹکڑے کر دیے تھے کی یاد دہانی کراتے ہوئے بہت سے ممبران نے بار بار یہ کہا تھا کہ مرکز کے اختیارات کو بڑی حد تک مضبوط کرنا چاہیے تاکہ وہ فرقہ وارانہ غیظ و غضب کو روکنے کا اہل ہو۔ صوبوں کے لیے اختیارات کے مطالبات پر رد عمل ظاہر کرتے ہوئے گوپال سوامی اینگر نے اعلان کیا تھا کہ ”مرکز کو جتنا مضبوط بنانا ممکن ہو سکتا ہے اتنا مضبوط بنانا ہوگا“ متحدہ صوبہ جات کے ایک ممبر بال کرشن شرمانے استدلالی پیرایہ میں تفصیلات پیش کرتے ہوئے کہا کہ صرف ایک مضبوط مرکز ہی ملک کی آسودگی کے لیے منصوبہ بنا سکتا ہے، دستیاب معاش وسائل کو منظم کر سکتا ہے، درست نظم و نسق قائم کر سکتا ہے اور غیر ملکی حملے کے خلاف ملک کا دفاع کر سکتا ہے۔

تقسیم ملک سے قبل کانگریس نے صوبوں کو معقول خود مختاری دینے پر اتفاق کیا تھا۔ یہ کسی قدر مسلم لیگ کو اطمینان دلانے کی کوشش تھی کہ جہاں مسلم لیگ اقتدار میں آئے گی ان صوبوں کے اندر دخل اندازی نہیں کی جائے گی۔ تقسیم ملک کے بعد زیادہ تر قوم پرستوں نے اپنا موقف تبدیل کر دیا تھا کیونکہ وہ محسوس کرتے تھے کہ لامرکز یہ ساخت (Decentralised Structure) کے لیے پہلے جیسے سیاسی دباؤ یہاں نہیں رہ گئے تھے۔

نوآبادیاتی حکومت کے ذریعہ نافذ اکائی والا نظام یہاں پہلے سے ہی موجود تھا۔ اس زمانے کے تشدد کے واقعات نے مرکزیت کو مزید آگے بڑھایا، اسے اب انتشار و بد نظمی پریشانی روک تھام کرنے اور ملک کی معاشی ترقی کا منصوبہ بنانے کے لیے ضروری طور پر دیکھا جانے لگا۔

بحث کیجیے

ایک مضبوط مرکزی وکالت کرنے والے لوگوں کے ذریعہ کون سے مختلف دلائل پیش کیے گئے تھے؟

اس طرح دستور، ہندوستانی یونین (مرکز) کا اپنی رکن ریاستوں پر حقوق کی بابت یقینی تعصب کو ظاہر کرتا ہے۔

5. ملک کی زبان

جب ملک کے مختلف علاقوں میں لوگ مختلف زبانیں بولتے ہوں، اور ہر زبان کے ساتھ اس کی اپنی ثقافتی وراثت وابستہ ہو تو پھر ایک ملک کس طرح تعمیر کیا جاسکتا ہے؟ کس طرح لوگ ایک دوسرے کو سن سکتے ہیں یا ایک دوسرے سے جڑ سکتے ہیں اگر وہ ایک دوسرے کی زبان سے بھی واقف نہ ہوں؟ دستور ساز اسمبلی کے اندر کئی مہینوں تک زبان کے مسئلے پر بحث ہوئی تھی اور اکثر شدید قسم کے دلائل وجود میں آئے۔

1930 کی دہائی تک کانگریس نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ ہندوستانی کو قومی زبان بنانا چاہیے۔ گاندھی جی نے محسوس کیا کہ ہر ایک شخص کو ایسی زبان میں بات چیت کرنی چاہیے جس کو عام آدمی آسانی کے ساتھ سمجھ سکے۔ ہندوستانی۔ ہندی اور اردو کا ایک آمیزہ۔ ہندوستان کے لوگوں کے ایک بڑے حصے کی مقبول زبان تھی اور یہ مختلف ثقافتوں کے باہمی تعامل کے ذریعہ مالا مال مخلوط زبان تھی۔ گزرتے وقت کے ساتھ مختلف طرح کے ماخوذوں سے الفاظ اور اصطلاحات شامل ہوتی گئیں اور اس لیے مختلف علاقے کے لوگ سمجھنے لگے تھے۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ مختلف النوع فرقوں اور طبقات کے درمیان ترسیل کی مثالی زبان بن جائے گی، یہ ہندو اور مسلمان کو اور شمال و جنوب کے لوگوں کو متحد کر سکتی ہے۔

تاہم انیسویں صدی کے آخر سے زبان — بطور ہندوستانی بتدریج تبدیل ہو رہی تھی۔ جوں جوں فرقہ وارانہ تنازعات شدید ہو رہے تھے ہندی اردو ایک دوسرے سے دور ہونا شروع ہو گئیں تھیں۔ ایک طرف فارسی اور عربی اصل کے تمام الفاظ کو خارج کر کے ہندی کو سنسکرت زدہ بنانے کی کوشش کی جا رہی تھی دوسری طرف اردو متواتر فارسی زدہ بنائی جا رہی تھی۔ اس کے نتیجے میں زبان مذہبی شناخت کی سیاست کے ساتھ وابستہ ہوتی گئی۔ تاہم گاندھی جی کا ہندوستانی کے مخلوط کردار میں یقین بنا رہا۔

5.1 ہندی کے لیے دلیل (A plea for Hindi)

دستور ساز اسمبلی کے ایک ابتدائی اجلاس میں متحدہ صوبہ جات کے ایک نامزد ممبر آر۔ وی۔ دھولیکر نے ایک جارحانہ دلیل دی کہ ہندی کو بحیثیت دستوری تشکیل کی زبان کے طور پر استعمال کیا جائے۔ جب کسی نے کہا کہ اسمبلی میں ہر ایک یہ زبان نہیں جانتا تو دھولیکر نے برجستہ جوابی فقرہ کہا

ماخذ 10

قومی زبان کی کیا خصوصیات ہونی چاہیں؟
(What should the qualities of a national language be?)

اپنی موت سے کچھ ماہ قبل مہاتما گاندھی نے زبان کے سوال پر اپنے نظریات دوہراتے ہوئے کہا تھا:
یہ ہندوستانی متواتر سنسکرت زدہ ہندی ہونی چاہیے اور نہ ہی فارسی زدہ اردو لیکن دونوں کا ایک خوشگوار آمیزہ ہونا چاہیے۔ اسے جہاں کہیں بھی ضروری لگے مختلف علاقائی زبانوں کے الفاظ بھی بے تکلفانہ داخل کر لینے چاہیے۔ اور غیر ملکی زبانوں سے بھی الفاظ جذب کر لینے چاہیں جو آسانی اور بہتر انداز میں ہماری قومی زبان کے ساتھ گھل مل سکیں اس طرح ہماری قومی زبان ایک غنی اور طاقتور آلے کی طرح یقیناً ترقی پذیر بن جائے گی جو انسانی خیالات اور جذبات کے مکمل دائرہ کا اظہار کرنے کی اہل ہوگی۔ خود کو ہندی یا اردو کے ساتھ محدود کر لینا، فہم و فراست اور حب الوطنی کے جذبہ کے خلاف ایک جرم ہوگا۔

ہریجن سبیک، 12 اکتوبر 1947

”اس ایوان میں جو لوگ ہندوستان کے لیے ایک دستور وضع کرنے کے لیے موجود ہیں اور ہندوستانی نہیں جانتے وہ اس اسمبلی کے ممبران بننے کے لائق نہیں ہیں ان کے لیے یہاں سے چلے جانا اچھا ہوگا۔“ جب اس تبصرہ سے افراتفری پھوٹ پڑی تو دھولیکر نے ہندی میں اپنی تقریر جاری رکھی۔ اس موقع پر جو اہل عمل نہرو کی دخل اندازی کے ذریعہ ایوان میں امن بحال ہو پایا، لیکن زبان کا مسئلہ مسلسل آنے والے تین سال تک اسمبلی کی کارروائی میں خلل ڈالتا رہا اور ممبران کو مشتعل کرتا رہا۔

تقریباً تین سال بعد 12 ستمبر 1947 کو ملک کی زبان پر دھولیکر کی تقریر نے ایک بار پھر ایک بڑا طوفان پیدا کر دیا۔ اب تک دستور ساز اسمبلی کی زبان سے متعلق کمیٹی (Language Committee) اپنی رپورٹ پیش کر چکی تھی اور جو لوگ قومی زبان کے طور پر ہندی کی وکالت کر رہے تھے اور جو اس کی مخالفت کرتے تھے ان کے درمیان تعطل ختم کرنے کے لیے تصفیہ کا ایک فارمولہ سوچ لیا تھا۔ اس نے طے کیا تھا لیکن ابھی تک رسمی طور پر اعلان نہیں کیا تھا کہ دیوناگری رسم الخط میں تحریر ہندی ہندوستان کی سرکاری زبان ہوگی لیکن ہندی کی طرف منتقلی بتدریج ہوگی۔ شروع کے پندرہ سالوں کے لیے، تمام سرکاری مقاصد (کام کاج) کے لیے انگریزی کا استعمال جاری رہے گا۔ ہر ایک صوبے کو صوبے کے اندر کے سرکاری کاموں کے لیے ایک علاقائی زبان کو منتخب کرنے کی اجازت ہوگی۔ دستور ساز اسمبلی کی زبان سے متعلق کمیٹی نے ہندی کو قومی زبان کے بجائے سرکاری زبان کے طور پر منسوب کرتے ہوئے امید کی کہ اس سے لوگوں کے جذبات کو مطمئن کیا جاسکے گا اور ایک حل تک پہنچنے میں مدد ملے گی جو تمام لوگوں کے لیے بہتر ہوگا۔

دھولیکر اکیلے نہیں تھے جن کو اس طرح کا قابل مفاہمت رویہ پسند نہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندی کو ایک سرکاری زبان نہیں بلکہ قومی زبان کا اعلان کیا جائے۔ انھوں نے ان لوگوں پر حملہ کیا جو اس بات پر احتجاج کر رہے تھے کہ ہندی زبان کو ملک پر زبردستی لا دیا جا رہا ہے اور دھولیکر نے ان لوگوں کا مذاق اڑایا جو گاندھی جی کا نام لے کر ہندی کے بجائے ہندوستانی کو قومی زبان بنانا چاہتے تھے:

جناب، کوئی بھی شخص مجھ سے زیادہ اس بات سے خوش نہیں ہو سکتا کہ ہندی ملک کی سرکاری زبان بن گئی ہے۔... کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہندی زبان کو ایک رعایت دی گئی ہے۔ میں کہتا ہوں ”نہیں“ یہ ایک تاریخی عمل کی تکمیل ہے۔

دھولیکر جس لہجہ میں اپنے معاملے میں دلائل پیش کر رہے تھے اس سے بہت سے ممبران کو خاص طور پر پریشانی ہو رہی تھی۔ ان کی تقریر کے دوران کئی مرتبہ اسمبلی کے صدر نے دھولیکر کو ٹوکتے ہوئے ان سے کہا تھا ”میں نہیں سوچتا کہ آپ اس طرح بولتے ہوئے اپنے معاملے کو آگے بڑھا پائیں گے، لیکن پھر بھی دھولیکر نے اپنی تقریر جاری رکھی۔“

5.2 مغلوب ہونے کا خوف

دھولیکر کی تقریر کے ایک دن بعد مدراس کی ممبر شرمیتی جی۔ درگابائی نے اس انداز میں ارتقا پذیر بحث و مباحثہ کے متعلق اپنی پریشانی کی وضاحت کی:

جناب صدر، ہندوستان کے لیے قومی زبان کا سوال جو ابھی حال تک تقریباً اتفاق رائے تک پہنچ گیا تھا، اچانک انتہائی تنازعہ فیہ مسئلہ بن گیا ہے۔ خواہ یہ صحیح ہے یا غلط غیر ہندی زبان بولنے والے علاقوں کے لوگوں کو یہ احساس کرایا جا رہا ہے کہ یہ جھگڑا یا یہ رویہ ہندی بولنے والے علاقوں کے نمائندے کے طور پر اس ملک کی مخلوط ثقافت پر ہندوستان کی دیگر طاقتور زبانوں کے قدرتی اثر کو موثر طور پر روکنے کے لیے لڑائی ہے۔

درگابائی نے ایوان کو مطلع کیا کہ جنوب میں ہندی کے خلاف مخالفت کافی قوی ہے۔ مخالفوں کا یہ محسوس کرنا شاید صحیح ہے کہ ہندی کے لیے یہ پروپیگنڈہ علاقائی زبانوں کی جڑیں کاٹنے کے مترادف ہے۔ تاہم دوسرے ممبران کے ساتھ انھوں نے بھی گاندھی جی کے اعلان کی تعمیل کی اور جنوبی ہندوستان میں ہندی کے لیے پروپیگنڈہ جاری رکھا، بہادرانہ مزاحمت کی، اسکول کھولے اور ہندی زبان میں کلاسوں کا انتظام کیا۔ ”اب ان سب کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا“۔ درگابائی نے پوچھا ”صدی کے ابتدائی سالوں میں ہم نے جس اشتیاق و جوش کے ساتھ ہندی کو قبول کیا تھا، اس کے خلاف میں یہ احتجاج دیکھ کر سکتے ہیں ہوں“۔ انھوں نے ہندوستانی کو لوگوں کی زبان کے طور پر قبول کر لیا تھا لیکن اب اس زبان کو بدلا جا رہا تھا، اردو اور دیگر علاقائی زبان کے الفاظ کو اس سے باہر کیا جا رہا تھا۔ انھیں احساس تھا بشمول ہندوستانی مخلوط کردار اور رفتہ رفتہ اسے مٹانے والے کسی بھی قدم سے مختلف زبان کے گروہ کے درمیان انتہائی بے چینی اور خوف کا پیدا ہونا لازمی تھا۔

جوں جوں بحث و مباحثہ تند و تیز ہوتا گیا بہت سے ممبران نے ہم آہنگی کے جذبے کے لیے اپیل کی۔ بمبئی کے ایک ممبر شری شکر راؤ دیو نے کہا کہ ایک کانگریس اور گاندھی جی کا پیرو ہونے کے ناطے وہ ہندوستانی کو قومی زبان کے طور پر قبول کر چکے ہیں لیکن انھوں نے خبردار کیا کہ ”اگر آپ (ہندی کے لیے) میرے دل سے حمایت چاہتے ہیں تو آپ کو اب کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس سے میرے اندر بدگمانی پیدا ہو اور جس سے میرے خوف کو تقویت ملے۔“ مدراس کے ٹی۔اے۔ راما لنگم چینیاری نے اس بات پر اصرار کیا کہ خواہ کچھ بھی کیا جائے احتیاط کے ساتھ کیا جائے، اگر جارحانہ انداز میں ہندی کے حق میں بیروی کی جائے گی تو اس سے ہندی کی مدد نہیں ہوگی۔ حتیٰ

کہ اگر لوگوں کا خوف بلا جواز تھا لیکن اس کو رفع کرنا چاہیے ورنہ اس مرحلے پر یہ بات تلخ احساسات پیچھے چھوڑ جائے گی۔ انھوں نے کہا: ”جب ہم ساتھ رہنا چاہتے ہیں اور ایک متحدہ ملک کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں تو ہم آہنگی ہونی ہی چاہیے اور لوگوں پر چیزیں زبردستی مسلط کرنے کا سوال پیدا نہیں ہونا چاہیے۔“

ہندوستان کا دستور گہرے غور و خوض اور بحث و مباحثہ کے عمل کے ذریعہ ظہور میں آیا تھا۔ اس کی بہت سی شقوں تک لیکن دین کے ایک عمل کے ذریعہ، دو مخالف حالتوں کے درمیان ایک درمیانی زمین تیار کر کے پیش کیا گیا تھا۔

ماہم دستور کی ایک مرکزی خصوصیت پر اہمیت کی حامل باہمی رضامندی ہوئی تھی۔ یہ رضامندی ہر ایک بالغ ہندوستانی کو حق رائے دہی دینے کے متعلق تھی۔ یہ یقین و اعتماد کا ایک بے نظیر عمل تھا، دیگر جمہوریت میں حق رائے دہی آہستہ آہستہ اور مرحلہ وار عطا کیا گیا تھا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور یونائیٹڈ کنگڈم (انگلینڈ) جیسے ملکوں میں سب سے پہلے حق رائے دہی صرف صاحب ملکیت مردوں کو عطا کیا گیا تھا اس کے بعد تعلیم یافتہ مردوں کو بھی اس پر کشش دائرے میں داخل ہونے کی اجازت ملی تھی۔ ایک طویل اور تلخ جدوجہد کے بعد مزید دور زراعتی پس منظر کے افراد کو بھی رائے دہی کا حق دیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ ایسا حق حاصل کرنے کے لیے خواتین کو ایک طویل جدوجہد کرنی پڑی تھی۔

دستور ہند کی دوسری اہم خصوصیت سیکولرزم پر زور تھا۔ دستور کے دیباچہ میں سیکولرزم کا اظہار اس طرح درج نہیں کیا گیا تھا لیکن دستور کی عمل آوری کے لیے ہندوستانی تناظر میں اس کی کلیدی خصوصیات کی توضیح مثالی انداز میں کی گئی تھی۔ بنیادی حقوق کے مربوط سلسلے خاص طور پر، مذہبی آزادی (آئین 25-28) ثقافتی اور تعلیمی حقوق (آئین 29-30) اور مساوات کے حقوق (آئین 14، 16، 17) کا مسودہ ہوشیاری کے ساتھ تیار کیا گیا تھا۔ ریاست کے ذریعہ تمام مذاہب کے ساتھ مساوی سلوک کرنے کی ضمانت دی اور خیراتی اور فلاحی ادارے قائم رکھنے کا حق بھی دیا۔ ریاست نے خود بھی مذہبی فرقوں سے دوری بنائے رکھنے کی کوشش کی، ریاست کے ذریعہ چلائے جانے والے اسکول اور کالجوں میں لازمی مذہبی ہدایات (تعلیم) پر روک لگادی اور نوکریوں میں مذہبی بھاد کو غیر قانونی اعلان کیا۔ تاہم مذہبی فرقوں کے اندر سماجی اصلاح کے لیے ایک معین قانونی گنجائش پیدا کر دی تھی۔ اس گنجائش کے استعمال سے ہی چھوٹ چھات پر پابندی لگی۔ ذاتی اور کنبہ کے قوانین میں تبدیلیاں متعارف کی گئیں۔ اگرچہ ہندوستانی سیاسی

سیکولرزم میں پھر مذہب سے ریاست کی مطلق علاحدگی نہیں رہ پائی لیکن ان دونوں کے درمیان ایک قسم کا منصفانہ فاصلہ بنا ہوا ہے۔

دستور ساز اسمبلی کے بحث و مباحثہ ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتے ہیں کہ دستور کی تشکیل سازی میں بہت سی متضاد آوازیں تصفیہ کی خاطر گفت و شنید کا حصہ بنی تھیں اور بہت سے مطالبات وضاحت سے کیے گئے تھے۔ یہ بحث و مباحثہ ہمیں ان نصب العین کے متعلق بتاتے ہیں جو طلب کیے گئے تھے اور ان بنیادی اصولوں کے متعلق بتاتے ہیں جس کو دستور کے بنانے والے بروئے کار لائے۔ لیکن ان بحث و مباحثوں کو پڑھتے وقت ہمیں باخبر رہنے کی ضرورت ہوگی کہ نصب العین کو ایک خاص تناظر کے اندر طلب کرنے پر موزوں نظر آنے کی مناسبت کے لحاظ سے اکثر دوبارہ وضع کیا گیا تھا۔ گاہے گاہے اسمبلی کے ممبران نے تین سالوں تک جاری بحث و مباحثہ کے دوران اپنے خیالات کو تبدیل کر دیا تھا۔ کچھ ممبران نے دوسروں کے دلائل سننے کے بعد اپنی حالت پر از سر نو غور کیا اپنے ذہنوں کو متضاد نظریات کے لیے کھول دیا، جب کہ دیگر کچھ ممبران نے اپنے اطراف کے واقعات کے رد عمل میں اپنے نظریات تبدیل کر دیے تھے۔



شکل 15.9

دستور کا مسودہ پیش کرتے وقت بہیم راؤ امبیڈکر اور راجندر پر ساد ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہوئے۔

ٹائم لائن	
1945	
26 جولائی	برطانیہ میں لیبر پارٹی اقتدار میں آئی
دسمبر جنوری	ہندوستان میں عام انتخابات
1946	
16 مئی	کابینہ کے مشن دستوری منصوبے کا اعلان
6 جون	مسلم لیگ نے کابینہ مشن کے دستوری منصوبے کو تسلیم کیا
16 اگست	مسلم لیگ کا ”ڈائرکٹ ایکشن ڈے“ کا اعلان
2 ستمبر	نہرو کونائب صدر کے ساتھ کانگریس کی عبوری حکومت نے تشکیل کی
13 اکتوبر	مسلم لیگ نے عبوری حکومت میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا
3-6 دسمبر	برطانوی وزیراعظم اسٹولی کی چند ہندوستانی لیڈروں سے ملاقات: بات چیت ناکام
9 دسمبر	دستور ساز اسمبلی کے اجلاس کی شروعات
1947	
29 جنوری	مسلم لیگ کو دستور ساز اسمبلی کو تحلیل کرنے کا مطالبہ
16 جولائی	عبوری حکومت کی آخری میٹنگ
11 اگست	جناب پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے صدر منتخب
14 اگست	پاکستان کی آزادی؛ کراچی میں جشن منایا گیا
14-15 اگست	نصف شب میں ہندوستان کی آزادی کا جشن
دسمبر	دستور ہند پر دستخط کیے گئے

100 سے 150 لفظوں میں جواب دیجیے



- 1- اہداف قرارداد میں کیا نصب العین بیان کیے گئے تھے؟
- 2- مختلف گروہوں نے اصطلاح ”اقلیت“ کی توضیح کس طرح کی تھی؟
- 3- صوبوں کے لیے وسیع اختیارات کے حق میں کیا دلائل پیش کیے گئے تھے؟
- 4- گاندھی جی ایسا کیوں سوچتے تھے کہ ”ہندوستانی“ قومی زبان ہونی چاہیے؟

مندرجہ ذیل پر ایک مختصر مضمون (250 سے 300 الفاظ پر مشتمل) لکھیے



- 5- وہ کون سی تاریخی قوتیں تھیں جنہوں نے دستور کی بصارت تشکیل دی تھی؟
- 6- مظلوم محکوم گروہوں کے تحفظ کے حق میں دیے گئے مختلف دلائل پر بحث کیجیے۔
- 7- دستور ساز اسمبلی کے ممبران نے اس زمانے کے سیاسی حالات اور ایک مضبوط مرکزی ضرورت کے درمیان کس طرح کے رابطے بنانے کی بات کی؟
- 8- دستور ساز اسمبلی نے زبان کے تنازع کو کس طرح حل کرنے کی کوشش کی؟

نقشہ کا کام



- 9- موجودہ دنوں ہندوستان کا سیاسی نقشہ ہر صوبہ میں بولی جانے والی مختلف زبانوں کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ایک دفتری زبان کو نمایاں کرتا ہے۔ آپ موجودہ نقشہ کا 1950 کی دہائی کے ابتدائی سالوں کے نقشہ سے موازنہ کیجیے۔ آپ اس میں کیا دیکھتے ہیں؟ کیا یہ اختلاف صوبہ کی تنظیم اور زبان کے رشتہ کی طرف کچھ اشارہ کرتے ہیں؟

پروجیکٹ (کوئی ایک)



- 10- کوئی ایک بہت اہم دستوری تبدیلی کا انتخاب کیجیے جو حال کے سالوں میں واقع ہوئی ہے اور پتہ لگائیے کہ یہ تبدیلی کیوں کی گئی، تبدیلی کے لیے کیا دلائل پیش کیے گئے تھے اور تبدیلی کا تاریخی پس منظر کیا تھا۔ اگر ممکن ہو تو دستور ساز اسمبلی کا بحث و مباحثہ دیکھنے کی کوشش کیجیے (<http://parliamentofindia.nic.in/is/debates/debates.htm>) اور دیکھیے کہ اس وقت مسائل پر کس طرح بحث کی گئی تھی۔ اپنی تحقیقات کے متعلق لکھیے۔

- 11- امریکہ، فرانس یا ساؤتھ افریقہ کے دستور سے ہندوستانی دستور کا موازنہ کیجیے۔ ذیل کے کن ہی دو پہلوؤں پر روشنی ڈالیے۔ سیکولرزم، اقلیتی حقوق، مرکز اور صوبوں کے درمیان رشتے۔ مقامی تاریخ سے یہ مماثلت یا اختلاف کیسے جڑے ہیں۔ وضاحت کیجیے۔



مزید معلومات کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ کیجیے:

گرین ول آسٹین۔ 1972

دی انڈین کانستٹی ٹیوشن:

دی کارنر اسٹون آف ای نیشن

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نئی دہلی

راجیو بھارگو۔ 2000

ڈیمو کریٹک ویزن آف ای نیو ریپبلک

ٹرانسفورمننگ انڈیا: سوشل اینڈ پالیٹیکل

ڈائنامکس آف ڈیمو کریسی

مرتبہ، ایف۔ آر فرینکل وغیرہم

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، نئی دہلی

سمت سرکار۔ 1983

انڈین ڈیمو کریسی: وی ہسٹو ویکل ان ہیر پینس

دی سکسینز آف انڈیا: ڈیمو کریسی

مرتبہ، اٹل بھٹی

کیمرج یونیورسٹی پریس، کیمرج

سمت سرکار، 1983

ماڈرن انڈیا 1947-1985

میک ملن، نئی دہلی



مزید معلومات کے لیے آپ مندرجہ ذیل ویب سائٹ

پر رابطہ کر سکتے ہیں:

<http://parliamentofindia.nic.in/is/debates/debates.htm>

(یہاں آپ دستور ساز اسمبلی کے بحث و مباحثہ کی

ڈیجیٹل اشاعت دیکھ سکتے ہیں۔

تصاویر کے لیے اظہار تشکر

ادارے

القاضی فاؤنڈیشن فار دی آرٹس، نئی دہلی

(تصاویر 11.6، 11.8، 12.12، 12.13)

کلکیشن جوتینڈرا اینڈ جوتا چین، CIVIC آرکائیوز، نئی دہلی

(تصویر 13.15)

فوٹو ڈیویژن، حکومت ہند، نئی دہلی

(تصاویر 14.3، 14.10، 15.3، 15.4، 15.5، 15.6، 15.9)

دی اوٹنر آرکائیو اینڈ لائبریری، ممبئی

(تصاویر 11.9، 11.18، 13.17)

وکتوریہ میموریل میوزیم اینڈ لائبریری، کولکاتہ

(تصاویر 10.6، 10.7)

رسائل

بلڈر (تصویر 12.26)

پنچ (تصاویر 11.13، 11.14، 11.17)

دی اسٹریٹ لائن نیوز (تصاویر 10.1، 10.10، 10.11، 10.12، 10.13، 10.14،

10.16، 10.17، 10.18، 10.19، 11.15، 11.16)

کتب

بلی، بی اے، دی راج: انڈیا اینڈ دی برٹش 1600-1947

(تصاویر 10.4، 11.10، 11.11، 12.27)

ڈیلی ریمیل، ولیم، دی لاسٹ مغل (تصویر 11.1)

ڈینیئل تھامس اینڈ ولیم، ویووز آف کولکاتہ

(تصاویر 12.7، 12.8، 12.9، 12.19)

ایونس نورما، دی انڈین میٹروپولس: آء ویو و ٹوورڈ دی ویسٹ

(تصاویر 12.14، 12.16، 12.20، 12.22، 12.23، 12.25، 12.29، 12.30)

میڈیکاف، ٹی آر، این امپریل ویژن: انڈین آرکنیکچر اینڈ برٹش راج (تصویر 12.28)

پبلی کیشنز ڈیویژن، مہاتما گاندھی (باب 14 میں بہت سی تصاویر)

روہے، پیٹر، گاندھی (تصاویر 13.7، 13.11، 13.12)

سنگھ، خشونت، ٹرین ٹو پاکستان (تصاویر 15.1، 15.4، 15.12، 15.13، 15.15)